رمز و کنایات

فراق گورکھپوری

بار اول .... دو ہزار

سنگم پبلشنگ ہاؤس - الہ آباد

سنہ ۱۹۴۷ء

مطبوعہ سلیمی برقی پریس - الہ آباد

۱

۱۹۳۷ء

نگاہِ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا!
حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا!
جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا!
دوچار برقِ تجلی سے رہنے والوں نے
فریبِ نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا!

دلوں پہ گرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ
تری نگاہ نے پہلو بچاتے ہیں کیا کیا!

نثار نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے
لبوں تک آتے ہوئے تھرتھراتے ہیں کیا کیا!

وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی
جگر کے زخم نہاں مسکراتے ہیں کیا کیا!

چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ
حجاب برقِ ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا!

بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر
نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا!

کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دلِ برباد
خرامِ ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا!

تغافل اور بڑھا اُس غزالِ رعنا کا
فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا!

ہزار فتنۂ بیدار خوابِ رنگیں میں
چمن میں غنچۂ گل رنگ لائے ہیں کیا کیا!

ترے خلوصِ نہاں کا تو آہ کیا کہنا!
سلوک اُچٹے بھی دل میں سمائے ہیں کیا کیا!

نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے
دلوں میں دردِ محبت اُٹھائے ہیں کیا کیا!

پیامِ حسن، پیامِ جنوں، پیامِ فنا
تری نگہ نے فسانے سُنائے ہیں کیا کیا!

تمام حُسن کے جلوے تمام محرومی
بجرمِ نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا!

فراقؔ راہِ وفا میں سُبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!

۳

سنہ ۱۹۲۵ء

ہیں ہوش عنادل ہوں مشکل ہے سنبھل جانا
"اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا"
تقدیرِ محبت ہوں مشکل ہے بدل جانا
سو بار سنبھل کر بھی معلوم سنبھل جانا
اُس آنکھ کی مستی ہوں اے بادہ کشو جس کا
اُٹھ کر سرِ میخانہ ممکن ہے بدل جانا

ایّامِ بہاراں میں دیوانوں کے تیور بھی
جس سمت نظر اُٹھی عالم کا بدل جانا

گھنگھور گھٹاؤں میں سرشار فضاؤں میں
مخمور ہواؤں میں مشکل ہے سنبھل جانا

ہوں لغزشِ مستانہ میخانۂ عالم میں
برقِ نگہِ ساقی کچھ بچ کے نکل جانا

اِس گلشنِ ہستی میں کم کھلتے ہیں گُل ایسے
دنیا مہک اُٹھے گی تم دل کو مَسل جانا

میں سازِ حقیقت میں سویا ہوا نغمہ تھا
تھا رازِ نہاں کوئی پردوں سے نکل جانا

ہوں نکہتِ مستانہ گلزارِ محبت میں
مدہوشیِ عالم ہے پہلو کا بدل جانا
مستی میں رُکاوٹ سے اُس آنکھ کا یہ کہنا
میخوار کی نیت ہوں ممکن ہے بدل جانا
جو طرزِ غزل گوئی مومن نے طرح کی تھی
صد حیف فراق اُس کا صد حیف بدل جانا

۳

۱۹۳۵ء

تھا رنگ اضطراب دلِ بے قرار کا
آنا رُلا گیا مجھے یادِ بہار کا
اُترا ہوا خمار مئے انتظار کا
رازِ آشنا ہوں میں کسی غفلت شعار کا
سازِ مجاز کی میں صدائے شکست ہوں
خمیازہ کش ہوں ہستیِ ناپائدار کا

بسمل فراقِ صبحِ ازل سے ہے ہر سحر
عالم تو دیکھ پیرہن تار تار کا

کوتاہیِ نصیبِ جنوں کچھ نہ پوچھئے
ہاتھوں میں آچکا تھا گریباں بہار کا

اک تیرے دردِ عشق نے بدلے ہیں کتنے بھیس
اچھا بہانہ ہے یہ غمِ روزگار کا

اب عشق ماورائے نشاط و ملال ہے
کچھ اضطرابِ دید نہ غم انتظار کا

مارا ہے کس ادا سے دلِ سوگوار کو
کشتہ ہوں تیری پرسشِ بیگانہ وار کا

وہ آنکھ اپنے کام سے غافل نہیں فراقؔ
کچھ دیر زہ سے بے ہوش ہر اک ہوشیار کا
پردے حریم ناز کے گرتے چلے فراقؔ
اٹھتا چلا ہے درد دل بے قرار کا

۴

۱۹۲۶ء

رات آدھی سے زیادہ گئی تھی سارا عالم سوتا تھا
نام ترا لے لے کر کوئی درد کا مارا روتا تھا

چارہ گرو یہ تسکیں کیسی! میں بھی ہوں اس دنیا میں
اُن کے ایسا درد کب اٹھا جن کو بچنا ہوتا تھا

کچھ سکا کچھ کہہ جاتا تھا میں فرقت کی بیتابی میں
سننے والے ہنس پڑتے تھے ہوش مجھے تب ہوتا تھا

تارے اکثر ڈوب چلے تھے رات کے رونے والوں کو
آنے لگی تھی نیند سی کچھ دنیا میں سویرا ہوتا تھا

ترک محبت کرنے والو! کون ایسا جگ جیت لیا
عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا تھا

دنیا دنیا غفلت طاری، عالم عالم بے خبری
حسن کا جادو کون جگائے ایک زمانہ سوتا تھا

اس کے آنسو کس نے دیکھے اس کی آہیں کس نے سنیں؟
چمن چمن تھا حسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا

پچھلا پہر تھا ہجر کی شب کا جاگتا رب سوتا سنسار
تاروں کی چھاؤں میں کوئی فراق سا جیسے موتی پروتا تھا

۵

سنہ ۱۹۳۷ء

خود نما ہو کے نہاں۔ چھپ کے نمایاں ہونا
الغرض حُسن کو رسوا کسی عنواں ہونا

کبھی صحرا کبھی گلشن کبھی زنداں ہونا
کبھی کونین کو ہمراہی گریباں ہونا

یُوں تو اکسیر ہے خاکِ درِ جاناں لیکن
کاوشِ غم سے اُسے گردشِ دوراں ہونا

حدِ تمکیں سے نہ باہر ہوئی خود دار نگاہ
آج تک آ نہ سکا حُسن کو حیراں ہونا

چارہ گر درد سراپا ہوں مرے درد نہیں
یاد آیا ہے مجھے نشتر کا رگِ جاں ہونا

مجھ سے بچنا ہی ترا ٹھیک ہوا اے دامنِ دوست
میرے غم کو ہے فقط میرا گریباں ہونا

دفترِ رازِ محبت تھا ملالِ دل پہ
وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پرساں ہونا

اب تو مجھ کو بھی مرے درد کا احساس نہیں
مشکلِ عشق مبارک ہے تجھے آساں ہونا

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم
کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

اپنا انجام اگر عشق سمجھتا ہے تو پھر
حسن کا کس لئے شرمندۂ احساں ہونا

اب تو تنگ آ گئے اِس کشمکشِ پنہاں سے
دل کے شیرازہ کو آیا نہ پریشاں ہونا

سازِ بے سوز سے دنیا نہیں بدلا کرتی
کارِ ہر نغمہ نہیں نغمۂ مستاں ہونا

وحشتِ عشق کا بڑھنا تو عدم ہو جانا
سمٹ آنا تو سراپردۂ امکاں ہونا

سر بسر برق فنا عشق کے جلوے ہیں فراق
خانۂ دل کو نہ آباد نہ ویراں ہونا

٦

سنہ ۱۹۳۷ء

ہے ابھی جو ہرِ ہستی کو نمایاں ہونا
ابھی فطرت کو ہے آئینۂ انساں ہونا
سر بسر جسم کے امکان میں ہے جاں ہونا
رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا
سازِ بے سوز ہے اے عشق یہ افسردہ حیات
دل کے پردوں کو سکھا شعلہ بداماں ہونا
رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب
یہ یک انداز اسے یک جا و پریشاں ہونا

دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے
نہ شبستاں نہ اِسے شمعِ شبستاں ہونا

ہم تو درماں کو بھی درد بنا لیتے ہیں
یوں تو اے درد مبارک تجھے درماں ہونا

بات یہ ہے کہ میں ناشاد بھی ہوں شاد بھی ہوں
عقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا

ذرّہ اپنا بھی ہے خورشیدِ قیامت لیکن
مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

وہ سیہ کارِ محبت ہوں میں واعظ کہ مجھے
قبلۂ دیں تو کبھی کعبۂ ایماں ہونا

دیکھ آشفتگیِ دہر نہ دیکھا ہو اگر
گیسوئے شاہدِ رعنا کا پریشاں ہونا

کس طرح عشق کی مشکل کو کوئی سہل کرے
جس کے آساں کو بھی آیا نہیں آساں ہونا

نزع میں دادِ وفا مل گئی بیماروں کو
سر بسر حسن کا تاخیرِ پشیماں ہونا

ہم ترے حور و پری ہونے سے مسرور نہیں
ہمیں درکار ہے انسان کا انساں ہونا

اور عالم ہے مری وادیِ وحشت کا فراق
اسے زنداں نہ بیاباں نہ گلستاں ہونا

ے

١٩٣٤ء

چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہونا
وحشیو یہ تو نہیں عاشقِ جاناں ہونا

تجھے دیکھا بھی تو اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
ترا سرتا بہ قدم عشوۂ پنہاں ہونا

دُکھتے دل کو نئے انداز سے دکھنا آیا
غمِ دوراں کو مبارک غمِ جاناں ہونا

فرشِ رہ دیدہ و دل ہیں ترے مشتاقوں کے
تیری آمد میں کوئی ساز نہ ساماں ہونا
چپّے چپّے میں ہے گلزار کے صد دشتِ جنوں
ذرّے ذرّے سے ٹپکتا ہے بیاباں ہونا
ٹھوکریں ہیں در و دیوار کی اور تیرے اسیر
سخت دشوار ہے شائستۂ زنداں ہونا
خود کو پہچان سکی دُکھ بھری دُنیا نہ ابھی
غمِ انساں کو نہ آیا غمِ انساں ہونا
اُف! وہ نیرنگِ جنوں چاک گریبانوں کے
کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی حیراں ہونا

اسے جو کچھ کوئی سمجھے اسے جو کچھ جانے

غمِ جاناں کو مگر کفر نہ ایماں ہونا

نگہِ شوخ نے چھیڑا ہے رگِ سازِ مجاز

دیکھ اب حسنِ حقیقت کا نمایاں ہونا

ہیں امیدیں بھی تغافل سے ترے یوں تو مجھے

مرا ہمراز نہ دمساز نہ پرساں ہونا

کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی

یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا

آج در پردہ جنوں سلسلہ جنباں ہے فراق

کھل گیا گیسوئے پُرخم کا پریشاں ہونا

۸

۱۹۳۸ء

نکل چلا تھا مگر حسن بے حجاب نہ تھا
ابھی شباب کا آغاز تھا شباب نہ تھا
وہ میکدہ تھا کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا
حریف رندِ سیہ مست آفتاب نہ تھا
کہیں یہی نہ ہو آغازِ ربطِ پنہاں کا
تری نگاہ میں پہلے تو یہ حجاب نہ تھا
کہیں یہی نہ ہو اعجازِ کارسازیِ عشق
اسی کا نام بنا کچھ جو کامیاب نہ تھا

کہیں نہ کیف و اثر تھا نہ تھا پتہ اپنا
حریمِ عشق میں خود عشق باریاب نہ تھا

زہے یہ تمکنتِ حسن و کیفِ سرمستی
چھلکنے کے لئے پیمانۂ شباب نہ تھا

سکوتِ ناز کو بیگانگی سمجھ بیٹھے
سوالِ دل ابھی شائستۂ جواب نہ تھا

تجھے خبر ہے کہ رات اُن نگاہِ مست سے ایک
خراب ہو کے بھی تیری طرح خراب نہ تھا

بڑھا رہا ہے کوئی رسمِ جذب کیا دل سے
سپردگی کی ادا میں یہ اجتناب نہ تھا

یہ موت خوبیِ تقدیرِ عشق ہے ورنہ
عذابِ غم کا بھی ایسا کوئی عذاب نہ تھا

ہوا ہے خوفِ سزا جرمِ عاشقی سنگیں
عتاب تھا، مگر اتنا اُسے عتاب نہ تھا

بس اک نظر سے جنوں کو بنالیا مانوس
یہ رنگِ حسن تو پروردۂ حجاب نہ تھا

حریمِ یار میں خاصانِ عشق تھے ہم لوگ
وہ کون فردِ بشر تھا جو انتخاب نہ تھا

وفورِ بےخودیِ بزمِ ناز کیا کہئے
کہ باریاب بھی جو تھا وہ باریاب نہ تھا

شکایتوں پہ سکوت زباں دراز نہ پوچھ
کہ لاجواب بھی ہو کر وہ لاجواب نہ تھا

کہیں وہی تو گریباں نہیں ہے آج اپنا
ترا وہ گوشۂ دامن جو دستیاب نہ تھا

تمام کشمکش دہر ایک غفلت تھی
کھلی جو آنکھ فضا میں وہ اضطراب نہ تھا

نہ جانے کیوں بھری دنیا میں خاک اڑتی ہے
بہ فیض عشق یہ دریا ابھی سراب نہ تھا

فراق یاد کرا ایسا بھی کوئی عالم عشق
جو ایک شب کا فسانہ نہ تھا جو خواب نہ تھا

۹

۱۹۳۷ء

دورِ آغازِ جفا دل کا سہارا نکلا
حوصلہ کچھ نہ ہمارا نہ تمھارا نکلا

تیرا نام آتے ہی سکتے کا تھا عالم مجھ پہ
جانے کس طرح یہ مذکور دوبارا نکلا

ہوش جاتا ہے جگر جاتا ہے دل جاتا ہے
پردے ہی پردے میں کیا تیرا اشارا نکلا

سب ہے تیرے کشف و کرامات کی دنیا قائل
تجھ سے اے دل نہ مگر کام ہمارا نکلا

کتنے سفاک سرِ قتل گہہِ عالم تھے
آنکھوں میں بس وہی اللہ کا پیارا نکلا

عبرت انگیز ہے کیا اُس کی جواں مرگی بھی
ہائے وہ دل جو ہمارا نہ تمہارا نکلا

عشق کی رُو سے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
رشکِ خورشیدِ قیامت یہ شرارا نکلا

سربسر بے سروساماں جسے سمجھے تھے وہ دل
رشکِ جمشید و کے و خسرو و دارا نکلا

روتے روتے ہوئے چپ ہجر کی دنیا بدلی
شمع بے نور ہوئی صبح کا تارا نکلا

انگلیاں اٹھیں فراقِ وطن آوارہ پہ
آج جس سمت سے وہ درد کا مارا نکلا

۱۰

۱۹۳۴ء

کچھ بو سی اُڑ رہی ہے یہ مستانہ وار کیا
چٹکا چمن میں شیشۂ ابرِ بہار کیا

اپنی نظر کا تجھ کو نہیں اعتبار کیا
یہ بار بار پُرسشِ بیگانہ وار کیا

تقلیدِ رسمِ جامہ دری سے بھی ہاتھ اُٹھا
خود کو مٹا دے پیرہن تار تار کیا

پیمانۂ حیات سے ہے اک جام بے خودی
یہ جس کے منہ لگا وہ رہے ہوشیار کیا
کوئی جواب دے تو خطاب و عتاب کر
اک بے زباں کی سرزنش بار بار کیا
رنگینیٔ فضا سے ہے ترا عشوۂ حجاب
ہوتا ہے اور جلوۂ صبح بہار کیا
دردِ فراق وجہ سکوں کب ہو اگر
امید ہی نہ ہو تو رہیں بے قرار کیا
رگ رگ میں آج دوڑ گئیں بجلیاں فراقؔ
ہو اور شرمگیں نگہ شرمسار کیا

۱۱

سنہ ۱۹۲۴ء

دار و رسن کا گھٹنے کو ہے اعتبار کیا
کہتا چلا اُدھر کوئی مستانہ وار کیا

ہو عشق سرنگوں سے بھی کوئی دوچار کیا
سچ ہے نگاہِ شوق کا بھی اعتبار کیا

ہستی کے بند بند جُدا ہو کے رہ گئے
دل پر پڑی تری نگہہ بے قرار کیا

بجھ بجھ کے داغ دل اُبھر آتے ہیں ہم نوا
مجھ قیدیِ قفس کی خزاں کیا بہار کیا

کچھ رنگ سا فضا سے ٹپکتا ہے اے جنوں
چھلکا ہوا ہے شیشۂ بادہ بہار کیا

بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا نازِ یار کو
یہ تو نے کر دیا دلِ ناکردہ کار کیا

اے دل کسی کی پہلی نگاہوں کو بھول جا
یاد آ گیا تجھے مرے غفلت شعار کیا

سب چھوڑ ہی چکے تھے بھروسا مراقِ ق
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ ترا اعتبار کیا

مُنھ پھیر کر فراقؔ وہ کچھ مسکرا دیئے
سنتے اب اور حالِ دلِ بے قرار کیا

دوریِ یار کا بھی غم ایسوں کے ملنے کا بھی غم
جن کو قریب پا کے جی اور اُداس ہو گیا

معصوم ہے محبت لیکن اسی کے ہاتھوں
یہ بھی ہوا کہ میں نے تیرا بُرا بھی چاہا

۱۲

۱۹۳۲ء

طُور تھا، کعبہ تھا، دل تھا جلوہ زارِ یار تھا
عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالمِ اسرار تھا

نشۂ صد جام کیفِ انتظارِ یار تھا
ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغرِ سرشار تھا

اک ادائے بے نیازِ قرب و دُوری کر دیا
ماورائے وصل و ہجراں حسن کا اقرار تھا

اے جنوں ہم تو دیارِ عشق میں کھوئے گئے
ہوش اتنا بھی نہیں کیا رنگ بوئے یار تھا

مدتیں گزریں فریبِ غم کو بھی کھائے ہوئے
یاد اتنا بھی نہیں جینے سے کیوں بیزار تھا

عہدِ الفت یوں نہ پورا ہو یہ ہے قسمت کی بات
تم ہو یا میں کب کوئی مشتبہ تھا کب انکار تھا

اُف سکونِ یاس کو بھی ناشکیبا کر دیا
آج کتنا شوخ اُس کا وعدۂ دیدار تھا

جوہرِ آئینۂ عالم بنے آنسو مرے
یوں تو یہ سچ ہے کہ رونا عشق میں بیکار تھا

حسن کا بھی آخرش ٹوٹا طلسمِ رنگ و بو
خارزارِ عشق ناداں رشکِ صد گلزار تھا

مجھ کو تو صبحِ ازل صبحِ قیامت ہوگئی
حشرِ وعدہ بھی بس اک رمزِ نگاہِ یار تھا

نسبت ان آنکھوں سے بھولوں یاد رکھوں جامِ مے
کب میں اتنا بے خبر کب اس قدر ہشیار تھا

شوخیِ رفتار وجہِ ہستیِ برباد تھی
زندگی کیا تھی غبارِ رہگزارِ یار تھا

اس حریمِ راز میں چوکی نگاہِ عشق بھی
ہنس رہا تھا حسن میں شرمندۂ دیدار تھا

الفتِ دیرینہ کا جب ذکر اشاروں میں کیا
مسکرا کر مجھ سے پوچھا تم کو کس سے پیار تھا

دل دُکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

الوداع اے بزمِ انجم ہجر کی شب الفراق
تا بہ صبحِ ناگہانی انتظارِ یار تھا

ذرہ ذرہ آئینہ تھا خود نمائی کا فراقؔ
سر بسر صحرا ئے عالم جلوہ زارِ یار تھا

۱۳

۱۹۳۷ء

عشقِ دیوانہ اگر چاک گریباں ہوتا

پھر نہ زنداں، نہ بیاباں، نہ گلستاں ہوتا

دیکھ لیتے کہ نہ غمگین، نہ شاداں ہوتا

عشق بڑھتا تو نہ پھر درد نہ درماں ہوتا

دلِ سوزاں میں نہ افسردگی یاس آتی

نہ یہ عالم ہی سرِ شمعِ شبستاں ہوتا

شورِ عالم جو ہم آہنگِ جنوں ہو جاتا
پھر یہ ہنگامہ بھی اک خوابِ پریشاں ہوتا

زخمِ پنہاں سے اگر اذنِ جنوں پا جاتا
یہی دل رشکِ چمن رشکِ بیاباں ہوتا

پینے والے ہی نہیں ورنہ وہ ساغر چلتے
جن کا ہر دور لیے گردشِ دوراں ہوتا

شوخیِ حسن ہو یا مصلحتِ عشق کوئی !
ورنہ میں اور خرابِ غمِ دوراں ہوتا

دلِ مظلوم کی حسرت تو بجا ہے لیکن
جانتا کون جو وہ شوخ پشیماں ہوتا

حُسن پھر حُسن ہے کچھ پرسشِ غم کی حد بھی
عشق پھر عشق ہے کس بات پہ نازاں ہوتا

فتنہ ساماں ہے دلِ بے سروساماں ورنہ
حسن کے پاس کوئی ساز نہ ساماں ہوتا

بچ گیا بخیۂ دیوانہ سے دامانِ بہار
ہاتھ پڑتے تو عجب رنگِ گلستاں ہوتا

مے تو مے نشۂ مے پی گئے تیرے بدمست
آگ لگ جاتی اگر شوقِ چراغاں ہوتا

مد و جزر ایک ہی طوفاں کے ہیں مستی و ہوش
عشق اگر کفر نہ ہوتا تو پھر ایماں ہوتا

کاش آفاق سے اس شرح و بیاں کے بدلے
تجھے آفاق بدل دینے کا ارماں ہوتا

ہو گیا چشمِ عدم سے بھی نہاں ناوکِ ناز
ابھی حسرت ہے کہ پیوستِ رگِ جاں ہوتا

میں تری چارہ گری کو نہیں کہتا، لیکن
چارہ گر دردِ نہاں کا نہیں درماں ہوتا

دیکھ کر لیے کسی عشق کوئی اور فراق
نہ سہی میں ہی شریکِ غمِ ہجراں ہوتا

۱۴

۱۹۳۶ء

ہجر و وصالِ یار کا پردہ اُٹھا دیا

خود بڑھ کے عشق نے مجھے میرا پتا دیا

گردِ غبارِ ہستیِ فانی اُڑا دیا

اے کیمیائے عشق مجھے کیا بنا دیا

وہ سامنے ہے اور نظر سے چھپا دیا

اے عشقِ بے حجاب مجھے کیا دکھا دیا

وہ شانِ خامشی کہ بہاریں ہیں منتظر
وہ رنگِ گفتگو کہ گلستاں کھلا دیا

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں
اُن وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا

معلوم کچھ مجھی کو ہیں ان کی روانیاں
جن قطرہ ہائے اشک کو دریا بنا دیا

اک برقِ بے قرار تھی تمکینِ حُسن بھی
جس وقت عشق کو غمِ صبر آزما دیا

ساقی مجھے بھی یاد ہیں وہ تشنہ کامیاں
جن کو حریفِ ساغر و مینا بنا دیا

معلوم ہے حقیقتِ غمہائے روزگار
دُنیا کو تیرے درد نے دُنیا بنا دیا

اے شوخیٔ نگاہِ کرم مدّتوں کے بعد
خوابِ گرانِ غم سے مجھے کیوں جگا دیا

کچھ شورشیں تغافلِ پنہاں میں تھیں جنھیں
ہنگامہ زارِ حشرِ تمنا بنا دیا

بڑھتا ہی جا رہا ہے جمالِ نظر فریب
حسنِ نظر کو حُسنِ خود آرا بنا دیا

پھر دیکھنا نگاہ لڑی کس سے عشق کی
گر حُسن نے حجابِ تغافل اُٹھا دیا

جب خون ہو چکا دلِ ہستی اعتبار
کچھ درد بچ رہے جنھیں انساں بنا دیا

گم کردۂ وفورِ غمِ انتظار ہوں
تو کیا چھپا کہ مجھ کو مجھی سے چھپا دیا

رات اب حریفِ صبحِ قیامت ہی کیوں نہ ہو
جو کچھ بھی ہو اس آنکھ کو اب تو جگا دیا

اب میں ہوں اور لطف و کرم کے تکلّفات
یہ کیوں حجابِ رنجشِ بیجا بنا دیا

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

۱۵

سنہ ۱۹۲۶ء

ہر شکوۂ نارواکو دیکھا
اے عشق تری وفاکو دیکھا

اے جوشِ جنوں کٹا نہ صحرا
تجھ سے زورِ آزماکو دیکھا

ہستی عدم نما کے صدقے
چھپتے ہوئے برملاکو دیکھا

دام اُس سے اُٹھے نہ کیمیائے دل کے
اس جنسِ گراں بہاکو دیکھا

تقدیر سے اب نہیں شکایت
اے دوست تری جفا کو دیکھا
دیکھے کوئی جیسے جاگتا خواب
حسنِ نازک نقا کو دیکھا
اے دردِ فراق اے غمِ دوست
عشقِ صبر آزما کو دیکھا
تاروں کے قلوب جیسے دھڑکیں
رات اُس کی ادا ادا کو دیکھا
ہم نے بھی فراقؔ جان دے کے
اُس ناوکِ بے خطا کو دیکھا

۱۶

۱۹۳۶ء

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا
تم کو دیکھا، خدا کو دیکھا

ہر چیز میں شانِ نیستی ہے
عدم ہستی نما کو دیکھا

موسیٰ کے بھی دم اُکھڑ چلے تھے
حسنِ نازک ادا کو دیکھا

اللہ ری شبنمِ تبسم
غش کھاتے ہوئے صبا کو دیکھا

محشر کی بھی راہ دیکھ لیں گے
تجھ سے صبر آزما کو دیکھا

منھ پھیر کے ادھر سے جانے والے
تجھ پر قہر خدا کو دیکھا

ہم نے بھی خدا سے موت مانگی
ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا

تیری وہی سر گرانیاں ہیں
ہم نے اپنی وفا کو دیکھا

ہم نے بھی سنا فراق کا حال
ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا

۱۷

۱۹۳۶ء

میکدے میں آج اک دنیا کو اِذنِ عام تھا
دورِ جامِ بے خودی بے گانۂ ایام تھا

روح لرزاں، آنکھ محوِ دید، دل ناکام تھا
عشق کا آغاز بھی شائستۂ انجام تھا

رفتہ رفتہ عشق کو تصویرِ غم کر ہی دیا
حسن بھی کتنا خرابِ گردشِ ایام تھا

غم کدے میں دہر کے یوں تو اندھیرا تھا مگر
عشق کا داغ سیہ بختی چراغِ شام تھا

تیری دزدیدہ نگاہی یوں تو نامحسوس تھی
ہاں مگر دفتر کا دفتر حسن کا پیغام تھا

شاق اہلِ شوق پر تھیں اس کی عصمت داریاں
سچ ہے، لیکن حسن در پردہ بہت بدنام تھا

محو تھے گلزارِ رنگا رنگ کے نقش و نگار
وحشتیں تھیں، دل کے سناٹے تھے، دشتِ شام تھا

بے خطا تھا حسن ہر جور و جفا کے بعد بھی
عشق کے سر تا ابد الزام ہی الزام تھا

یوں گریباں چاک دنیا میں نہیں ہوتا کوئی
ہر کھلا گلشن شہیدِ گردشِ ایام تھا

دیکھ حسنِ شرمگیں در پردہ کیا لایا ہے رنگ
عشق رسوائے جہاں بدنام ہی بدنام تھا

رونقِ بزمِ جہاں تھا گو دلِ غمگیں فراقؔ
سرد تھا، افسردہ تھا، محروم تھا، ناکام تھا

تمہیں پاکر بھی کیوں رہتی شکایت کس مپرسی کی
مرے تم ہوگئے مجھ کو بھی گر اپنا بنا لیتے

۱۸

سنہ ۱۹۲۱ء

کارگہ عشق میں اب تک غمِ پنہاں نہ ہوا
میں ابھی بے خبرِ کلفتِ ہجراں نہ ہوا

مارِ غم وحشت تو زدی مجھے زنداں نہ ہوا
در و دیوار سے کچھ ہوش کا ساماں نہ ہوا

باغ میں بادِ صبا بھیجنے والے ہر صبح
ہم اسیرانِ قفس پہ کبھی احساں نہ ہوا

نگہِ ناز سے ہے اور اہلِ ہوس کے دل ہیں
ہائے وہ تیر جو پیوستِ رگِ جاں نہ ہوا

دشتِ غربت میں پریشاں نہیں دل تنگ نہیں
ابھی دیوانہ ترا قابلِ زنداں نہ ہوا

ہم نے دیکھا ہے وہ اندازِ جنوں بھی جو کبھی
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں نہ ہوا

رنگ کو حسرتِ پرواز ابھی باقی ہے
عالمِ نکہت برباد گلستاں نہ ہوا

دار سے اٹھتا ہے اک نعرۂ مستانہ ہنوز
ہائے وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا

ہاں سمجھا دے دلِ سوزاں کو مگر تو جانے
بزمِ ہستی میں جو یہ سوختہ ساماں نہ ہوا
خوبیاں تجھ میں ہیں اے عشق زمانے بھر کی
یہ تو کچھ دعویِ ہمتائی خوباں نہ ہوا
حسنِ گلزار سے دل چاک ہوا جاتا ہے
جوشِ گل چارہ گرِ تنگیِ داماں نہ ہوا
سرِ حاریں جلوہ گہہ ناز سے جس کی نہ ملیں
وہ تو اک کھیل ہوا چاک گریباں نہ ہوا
کہتی ہے وصل کی شب وہ نگہِ خواب آلود
ختم ابھی قصۂ بیتابیِ ہجراں نہ ہوا

آج تک صبحِ ازل سے وہی سناٹا ہے
عشق کا گھر کبھی شرمندۂ مہماں نہ ہوا

زندگی کیا وہ ترے غم سے جو دل تنگ نہیں
کیا وہ شیرازۂ ہستی جو پریشاں نہ ہوا

اہلِ زنداں کا یہ مجمع ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا[1]

وصال کو بھی بنا دے جو عینِ دردِ فراق
اسی سے چھوٹنے کا غم سہا نہیں جاتا

[1] یہ غزل آگرہ جیل کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

۱۹

سنہ ۱۹۳۰ء

ماتمِ عشق سرِ چرخِ بریں دیکھ لیا
شامِ ہجر ہم سے نے ترا خونِ جبیں دیکھ لیا
بزم اُلٹ جائے گی ساقی جو ترے ہاتھوں سے
جامِ رندوں سے نے چھلک جائے کہیں دیکھ لیا
تیر آہوں سے نے وہ مارے ہیں کہ تاثیر کو بھی
کروٹیں لیتے سرِ عرشِ بریں دیکھ لیا

مئے سرجوشِ تجلّی کو چھلکتے واعظ
ہم نے ساقی کی اداؤں کے قریں دیکھ لیا

دہم میں بھی جو نہ آتے تھے وہ شبخوں کر جائیں
چوٹ اُبھری کہ گلِ شمع یقیں دیکھ لیا

دھنس گئی گورِ غریباں کی زمیں کس نے یہاں
آ کے کن آنکھوں سے گل سوئے زمیں دیکھ لیا

کر کے خم گردنِ تسلیم کو معصوموں نے
دیکھ لی تیغِ ستم خنجرِ کیں دیکھ لیا

کون ہر سو سرِ شوریدہ لئے پھرتا تھا
اے فراقؔ آج تمھیں گوشہ نشیں دیکھ لیا

۳۰

۱۹۳۷ء

ہو کے سرتابقدم عالمِ اسرار چلا
جو چلا میکدۂ عشق سے سرشار چلا

ہمرہِ حسن اک انبوہِ خریدار چلا
ساتھ اس جنس کے بازار کا بازار چلا

اس سے تو قید ہی اچھی تھی کہ چھٹ کے ہر اسیر
لے کے آشفتگیِ گیسوئے خمدار چلا

ہوش اُڑتے جاتے ہیں ساقی یونہی میخواروں کے
جادوئے چشم سیہ کار نہ زنہار چلا

یہ اشاراتِ نہاں اہلِ ہوس کیا سمجھیں
ایسوں میں تذکرۂ عشق نہ بیکار چلا

لی ہے خود صبح نے انگڑائی خمار آلودہ
رات وہ دَورِ مئے ساغرِ سرشار چلا

نہ ہوا راہِ محبت میں کوئی عہدہ برآ
جو سبکدوش ہوا ابھی وہ گراں بار چلا

یوں تو کیا کہنا تری بزم کا جس سے ہر ایک
چارہ ناچار چلا بیدل و بیزار چلا

اُن کا جو حال کہ پہلے تھا وہی حال رہا
تیرے غم کشتوں سے اقرار نہ انکار چلا

شوخیِ حسن سلامت، تجھے شمشیر سے کیا
یہ چمکتی ہوئی چلتی ہوئی تلوار چلا

وہ سکوں پوچھ نہ کیا تھا شبِ غم جب دل سے
عشق خود اپنے مٹاتا ہوا آثار چلا

خونِ حسرت کا شہیدوں پہ کھلا رنگ اس وقت
جب اُٹھائے ہوئے وہ دامنِ گلنار چلا

قید سے چھٹ کے بھی دل تنگ رہا تیرا اسیر
سوئے صحرا لئے رنجِ در و دیوار چلا

آسماں ہو کہ قیامت ہو کہ ہو تیر قضا
چال اس فتنۂ دوراں سے ہر اک ہار چلا
بے نیازانِ محبت کو تھے وہ زعم کہ بس
خیر اتنا تو ہوا جو بھی تھا سر مار چلا
ذوقِ نظّارہ اسی کا ہے جہاں میں تجھ کو
دیکھ کر بھی جو لئے حسرتِ دیدار چلا
تیرے وارفتۂ غم ہوش میں آتے ہی نہیں
ان پر اب کچھ عملِ نرگسِ بیمار چلا
حسن کافر سے کسی کی نہ گئی پیش فراقؔ
شکوہ یاروں کا نہ شکرانۂ اغیار چلا

۲۱

سنہ ۱۹۳۸ء

عشق فسردہ ہی رہا غم نے جلا دیا تو کیا
سوزِ جگر بڑھا تو کیا دل سے دھواں اٹھا تو کیا
پھر بھی رگوں میں عشق کی حسن کی وہ کسک کہاں
ہر دلِ بے قرار میں درد دبا دیا تو کیا
پھر بھی تو شبنمی ہے آنکھ پھر بھی تو ہونٹ خشک ہیں
زخمِ جگر ہنسا تو کیا غنچۂ دل کھلا تو کیا

پھر بھی تو ہے خود انِ غم رازِ سکوں نہ پا سکے
تو نے نظر کی لوریاں دے کے سلا دیا تو کیا

پھر بھی مری صدائے درد تیرے لئے سکوت ہے
ہل گیا آسماں تو کیا کانپ اٹھی فضا تو کیا

عشق کی غفلتیں نثار چھیڑ نہ اے خیالِ یار
جس میں مرے اک جہانِ غم کو جگا دیا تو کیا

کون سا فرق آ گیا گردشِ روزگار میں
اشک ٹپک پڑے تو کیا عشق تڑپ اٹھا تو کیا

پھر طلسم در طلسم ضبط فریب در فریب
اشک بھی تھم گیا تو کیا دل بھی بہل گیا تو کیا

اور اُلجھ کے رہ گیا قصۂ حیات و موت کا
زیست کے راز کھولتی بحثِ فنا بقا تو کیا

منزلِ بیخودیٔ عشق موت کو بھی نہ مل سکی
جائے گی اتنی دور تک عمرِ گریز پا تو کیا

دیکھ فضائیں جاگ اُٹھیں زندگی جگمگا اُٹھی
سازِ جنونِ عاشقی چھڑتے ہی سو گیا تو کیا

موجِ فنا کو کشتیاں چھیڑ گئیں سکر دیکھتی
بحر کی بیکرانیاں غفلت نا خدا تو کیا

مہرِ دوام مل گئی عالمِ سوز و ساز کو
مجھ کو مٹا دیا تو کیا دل کو بجھا دیا تو کیا

عذرِ ستم کی جان تھی رنجشِ بے سبب تری
جھک بھی گئی نظر تو کیا آ بھی گئی حیا تو کیا

اب تو تری صدا بھی ہے میری صدائے بازگشت
آج سوالِ عشق پر آئی بھی اک ندا تو کیا

اور اُداس کر دیا رنگِ سکوتِ ناز نے
وجہِ ملال پوچھتی نرگسِ آشنا تو کیا

دیکھنے والے کو ترے حسرتِ دید رہ گئی
پردہ سا اُٹھ گیا تو کیا نور سا ہو گیا تو کیا

تھیں مری بے قراریاں محرمِ عشوۂ نہاں
ہوش نہ تھے بجا تو کیا دل نہ ٹھکانے تھا تو کیا

وہ تو کسی کا بامِ نازِ راہِ جنوں سے مل گیا
کاٹتی یہ چڑھائیاں عقلِ شکستہ پا تو کیا

دیکھ رہا ہوں اور کچھ حسن کرشمہ ساز ہیں
ناز تو کیا ادا تو کیا عشوہ تو کیا حیا تو کیا

سود و زیاں کے لفظ بھی وہم و گماں ہیں سر بسر
حسن بھی پا سکا تو کیا عشق بھی کھو سکا تو کیا

اپنی نگاہ کے فریب راز نشاطِ عشق ہیں
دیدۂ شوق بھی ترے حسن کو دیکھتا تو کیا

غربت و گمرہی کا نام کوچۂ یار رکھ دیا
گو ہمیں تمام منزلیں عشق کے زیرِ پا تو کیا

کوئی مزاج داں نہ تھا گردشِ روزگار کا
حسن تھا شادماں تو کیا عشق اداس تھا تو کیا
پھر بھی تری نظر کی یاد آہی گئی فراق کو
بارِ نیاز و نازِ عشق حسن سے اٹھ سکا تو کیا

پیکار دونوں میں ہے پیچ بہت سہل کا سوال
سرِ حرفِ سوال ہے عنوانِ شوق کا

۲۳

۱۹۳۶ء

جہانِ غنچۂ دل کا فقط چٹکنا تھا
اسی کی بوئے پریشاں وجودِ دنیا تھا

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا
وہ اک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا

طنابیں کوچۂ قاتل کی کھنچتی جاتی تھیں
شہیدِ تیغِ ادا میں بھی زور کتنا تھا

بس اک جھلک نظر آئی اُڑے کلیم کے ہوش
بس اک نگاہ ہوئی خاکِ طورِ سینا تھا

ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما
کہ اپنے آپ سے بیگانہ وار جینا تھا

یہی ہوا کہ فریبِ امید و یاس مٹے
وہ پا گئے ترے ہاتھوں نہیں جو پانا تھا

چمن میں غنچۂ دل کھلکھلا کے مرجھائے
یہی وہ تھے جنھیں بس ہنس کے جان دینا تھا

نگاہ وہ سرمئی جس کی ہیں صد پیامِ فنا
اسی کا عالمِ ایجادِ نازِ بیجا تھا

جہاں تو جلوہ نما تھا لرزتی تھی دنیا
ترے جمال سے کیا جلال پیدا تھا

حیات و مرگ کے کچھ راز کھل گئے ہوتے
فسانۂ شبِ غم ورنہ دوست کیا تھا

شبِ عدم کا فسانہ گداز شمعِ حیات
سوائے کیفِ فنا میرا ماجرا کیا تھا

کچھ ایسی بات نہ تھی تیرا دور ہو جانا
یہ اور بات کہ رہ رہ کے درد اٹھتا تھا

نہ پوچھ سود و زیاں کارِ بارِ الفت کے
وگرنہ یوں تو نہ پانا تھا کچھ نہ کھونا تھا

لگاوٹیں وہ ترے حسن بے نیاز کی آہ
میں تیری بزم سے جب ناامید اٹھا تھا

تجھے ہم اے دلِ درد آشنا کہاں ڈھونڈیں
ہم اپنے ہوش میں کب تھے کوئی جب اٹھا تھا

عدم کا راز صدائے شکستِ سازِ حیات
حجابِ زیست بھی کتنا لطیف پردا تھا

یہ اضطراب و سکوں سبھی تھے اک فریبِ حیات
کہ اپنے حال سے بیگانہ وار جینا تھا

کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے
زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا

یہ کوئی یاد ہے یہ بھی ہے کوئی محویت
ترے خیال میں مجھ کو بھی بھول جانا تھا

کہاں کی چوٹ ابھر آئی تھی حسنِ تاباں میں
دمِ نظارہ وہ رُخ درد سا چمکتا تھا

نہ پوچھ رمز و کنایات چشمِ ساقی سے
بس ایک حشرِ خموش انجمن میں برپا تھا

چمن چمن تھی گلِ داغِ عشق سے ہستی
اسی کی نکہتِ برباد کل زمانہ تھا

وہ تھا مرا دلِ خوں گشتہ جس کے مٹنے سے
بہارِ باغِ جہاں تھی وجودِ دنیا تھا

قسم ہے بادہ کشو چشمِ مستِ ساقی کی
بتاؤ ہاتھ سے کیا جامِ مے سنبھلتا تھا

وصال اُس سے میں چاہوں کہاں یہ دل میرا
یہ رو رہا ہوں کہ کیوں اُس کو میں نے دیکھا تھا

امید یاس بنی یاس پھر اُمید بنی
اُس اک نظر میں فریبِ نگاہ کتنا تھا

یہ سوز و سازِ نہاں تھا وہ سوز و سازِ عیاں
وصال و ہجر میں بس فرق تھا تو اتنا تھا

شکستِ سازِ چمن تھی بہارِ لالہ و گل
خزاں مچلتی تھی غنچہ جہاں چٹکتا تھا

ہر ایک سانس ہے تجدید "یادِ ایامے"
گزر گیا وہ زمانہ جسے گزرنا تھا

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا سب کو
فراق نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا[1]

[1] عین جوانی میں اپنے بڑے بھائی کی موت دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔
فراق

۲۳

۱۹۴۰ء

جنت میں آتی ہے قیامت
کھلتے ہیں دوزخ پہ درِ رحمت
اتنی شکیبا کب تھی طبیعت
عشق کی ہے اب نازک حالت
تیری صورت تیری محبت
یہ بھی کہانی وہ بھی حکایت
دل کی ٹھنڈک ہے وہی صورت
آگ بجھے گی تو ہے قیامت

خندۂ و گریہ شکر و شکایت
سب سے الگ وجدانِ محبت
اس کی نظر رودادِ محبت
حرف و حکایت شکر و شکایت
عشق کہے کیا حسن کرے کیا
یوں بھی بدل جاتی ہے طبیعت
راہِ طلب میں ایک سہارا
بندھتی ہمت ٹوٹتی ہمت
چھوڑ نہ مجھ کو چھوڑ نہ مجھ کو
یوں تو ہیں یکساں وصل و فرقت

بے خبری کی دو تصویریں
تیرا تغافل میری محبت
جان کا دینا جان کا لینا
یہ بھی محبت، وہ بھی محبت
آنکھوں کے ہوتے دل کے ہوتے
عشق کی سمجھے قدر نہ قیمت
مٹ کے ہیں خوش تو بچکے بھی غمگیں
نیت نیت، قسمت قسمت
صبرِ دلِ ایوب ہوں اب ہیں
اے تری رحمت اے تری رحمت

اُس کی طرح مجھے بھول نہ جانا
اے غمِ فرقت، اے غمِ فرقت
ہجر کا رونا، وصل کا رونا
یوں بھی مصیبت، یوں بھی مصیبت
جَور کرم سا، لطف ستم سا
ایک معمّہ حُسن کی فطرت
غم پہ فتح تو پائی۔ لیکن
پہچانی جاتی نہیں صورت
کون فراقؔ یہ باتیں سمجھے
تو نے بھی چھیڑی کیسی حکایت

۳۴

سنہ ۱۹۴۰ء

قصہ ہے تیرا یا تری رحمت
عشق، محبت، الفت، چاہت
چھوڑ یہ بحثِ مجاز و حقیقت
پہلے محبت سیکھ محبت
تیری صورت، میری طبیعت
یہ بھی کہانی وہ بھی حکایت

دُنیا کی بدلی جو حالت
حسن بھی بھولا ناز و نزاکت

اک مدت سے ہے اب تو یہ حالت
ہوش نہ غفلت رنج نہ راحت

سیدھی قسمت ٹیڑھی قسمت
سب کا علاج ہے دردِ محبت

ایک دل کے نام ہیں دونوں
دوزخ کہئے اُسے یا جنت

حسن ہے بےبس دیکھ کے تجھ کو
اے دلِ مضطر غیرت غیرت

عشق عذاب ضرور ہے لیکن
اس سے بچنے کی کوئی صورت
حسن کا دل بھی بھر آتا ہے
پھر بھی ہوں شاداں اُف ری طبیعت
دیکھیں رہے یہ رنگ بھی کب تک
گھٹتی محبت، بڑھتی مُروت
ایک ہی وقت میں خوش بھی غمیں بھی
یہ بھی ہے اک شانِ محبت
آج تمھیں دل کو سمجھاؤ
میری تو پڑتی نہیں ہمت

ایک عشق اور اِستنے دشمن

ایک مصیبت لاکھ مصیبت

کیا کہنا تجھ کو گر ملتی

تیری صورت میری طبیعت

رہگذرِ عُشّاق رہی ہے

دوزخ دوزخ جنت جنت

حسن ہی ہے یا اور کچھ لے دل

جانِ عشق، ایماں محبت

سوچ رہا ہوں زمانہ گذرا

کھائے ہوئے فریبِ محبت

عشق ابھی سے تنہا تنہا
ہجر کی بھی آئی نہیں نوبت
کچھ تو نے بھی سُنا؟ کہتے ہیں
اور ہے اب تو فراق کی حالت

ہمارے سرپرست تو یہ سرکاری طبیب نہیں
تمہارے سامنے یہ ہیں جو سرکاری ادیب نہیں

۲۵

۱۹۳۸ء

ہنگامہ خیز دورِ محبت ہے دُور دُور
دنیا میں آج شورِ قیامت ہے دُور دُور
ہر منزل و مقام سے وحشت ہے دُور دُور
اب تو نگاہِ ناز کی شہرت ہے دُور دُور
خونِ جگر سے سوزِ غمِ عشق سے تری
شوخی ہے دُور دُور شرارت ہے دُور دُور

دنیائے اعتبار میں تو ہی نہیں ملا
یوں تو رسائی غمِ فرقت سے ہے دُور دُور
اے نرگسِ سیاہ تری وحشتیں بجا
خود مجھ سے اب جنونِ محبت ہے دُور دُور
ہر منزل و مقام سے ہر ہست و نیست سے
یہ کیوں کشاکشِ غمِ الفت ہے دُور دُور
دل سے، تری قسم، سمجھے ہم پائیں یا نہ پائیں
لالچ ہے دُور دُور قناعت ہے دُور دُور
کیا بات ہے کہ پرسشِ پیہم کے باوجود
دل سے تری نگاہِ مروت ہے دُور دُور

معصومیِ نگاہ کی کیفیتیں تو دیکھ
پہنچی ہوئی اس آنکھ کی نیت ہے دُور دُور

تاریکیاں مجاز کی اکثر چمک گئیں
جلوہ فروزِ شمعِ حقیقت ہے دُور دُور

مٹ کر بھی ہم سمجھ نہ سکے جس کی نیتیں
سنتے ہیں اس نظر کی شکایت ہے دُور دُور

دنیا میں آج کوئی کسی کا نہیں رہا
اے لطفِ یار تیری ضرورت ہے دُور دُور

پھرتی ہیں جو گھنی ہوئی پلکوں کے سائے سائے
اُن نشترِ مگیں نگاہوں کی شہرت ہے دُور دُور

سچ ہے کہ مجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں

یہ کم ہے مجھ سے تیری عنایت ہی دُور دُور

دیکھیں فراق عشق کی یہ کس مپرسیاں

اب درد دُور دُور ہے راحت ہے دُور دُور

اے دوست محبت کی کچھ پوچھ نہ مجبوری

سرسا یہ جبر تری قسمت اک ہجر تری دوری

۳۶

۱۹۳۷ء

ترا جمال بھی ہے آج اک جہانِ فراق
نگاہِ لطف و کرم خود ہے ترجمانِ فراق
فضا جہانِ محبت کی جن سے تھی رنگیں
تجھے بھی یاد کچھ آئے وہ شادمانِ فراق
نظر بچا کے جنھیں برقِ حسن چھوڑ گئی
ملے نہ زخم نہاں میں بھی وہ نشانِ فراق

نگاہِ ناز تری تھی تمام قول و قسم
کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمانِ فراق

رُلا گئی ترے آسودگانِ خاک کی یاد
وہ بے نیازِ محبت وہ رازدانِ فراق

اُٹھے ہیں تیغِ تغافل کے کھول کر جوہر
نہ کیوں ہوں زندۂ جاوید کشتگانِ فراق

بتا تو کیا نگہِ اوّلیں کے بعد ہوا
مجھے بھی یاد ہے کم کم وہ داستانِ فراق

امید بن کے نہ آ بے دلوں کی دُنیا میں
اسے سمجھ نہیں سکتے یہ بد گمانِ فراق

وہ بے قراریِ دل وہ فضائے تنہائی
وہ سرزمینِ محبت وہ آسمانِ فراق

گدازِ دل سے حقیقت سرشکِ غم کی نہ پوچھ
ہر ایک قطرہ تھا اک بحرِ بیکرانِ فراق

جسے مٹا نہ سکی برقِ کم نگاہیِ حسن
وہی امید کی دنیا ہے پاسبانِ فراق

خود آشنا نہیں ان سے حریمِ تنہائی
یہ سوز و ساز ہیں ناخواندہ میہمانِ فراق

سکونِ قرب سے کچھ بے قرار تنگ آ کر
سنا ہے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ارمانِ فراق

خبر کچھ اُن کو نہیں اب ترے تغافل کی
بس آج چین سے سوئے بلاکشان فراق

جو ایک برقِ نگہہ سامنے سے کوند گئی
وہی تھی رُوحِ محبت وہی ہے جانِ فراق

چھپ کے تجھ سے کہیں دیکھنا نہ پڑ جائے
وصال ایسوں کا جن کی جدائی شاق نہیں

۲۷

۱۹۳۶ء

ایک عالم پہ بار ہیں ہم لوگ
کس کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ

صد بقا صد فنا کی ہیں تصویر
عالمِ انتظار ہیں ہم لوگ

ہم سے شادابیاں حیات کی ہیں
چشمِ خوننابہ بار ہیں ہم لوگ

ہم سے ہے گرم سینۂ ہستی
وہ بھڑکتے شرار ہیں ہم لوگ

ہم سے پھوٹی شعاعِ صبحِ حیات
مطلعِ روزگار ہیں ہم لوگ

ہم میں پنہاں رموزِ نشو و نمو
پردہ دارِ بہار ہیں ہم لوگ

ہم نے توڑی ہر ایک قیدِ حیات
کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ

ہم نے فردا کو کر دیا امروز
کیا قیامت شعار ہیں ہم لوگ

زندہ باد! انقلاب زندہ باد!

سرمکیف ہیں سرشار ہیں ہم لوگ

اثر درد زندگی سے فراق

بے خود و بے قرار ہیں ہم لوگ

یعنی صبح ازل سے اپنے لئے

ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

یونہی سا کچھ تھا رنج و ناز میل ملاپ کچھ یونہی

آکے یہیں پہ قرب دوست ہجر دوام بن گیا

۳۸

۱۹۱۹ء

کیا کہیں آئے تھے کس اُمید سے کس دل سے ہم
اک جنازہ بن کے اُٹھتے ہیں تری محفل سے ہم

رفتہ رفتہ موت کی نیند آ گئی ہنگامِ ذبح
سو گئے افسانۂ بیدردیٔ قاتل سے ہم

اب محبت بھی تری سعیِ تشفی بن گئی
ورنہ یوں مایوس ہوتے تھے ذرا مشکل سے ہم

اپنا پیمانِ وفا پھر یاد کر لے ایک بار
آج ہوتے ہیں جدا اے دوست تیرے دل سے ہم

رُوٹھ کر تجھ سے بہت بیدرد ہم بھی ہو گئے
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھنچے قاتل سے ہم

جا رہے ہیں چوٹ سی دل پہ لئے اے دوستو!
پہنچے تھے اس محفل میں بڑی مشکل سے ہم

جان لیوا اے جنوں گو ہیں یہ سرگردانیاں
کیوں بھٹک جاتے ہیں لیکن خود رہِ منزل سے ہم

رُکنے والو سختیِ منزل اسی کا نام ہے
چل نہیں پڑتے خیالِ سختیِ منزل سے ہم

نبھ نہیں سکتا کبھی ایسوں کا باہم ارتباط
فطرتاً رکھتے ہو نفرت حق سے تم باطل سے ہم

آج کوچے میں ترے سمجھ کو خبر ہے یا نہیں
ہو گئے رو کر جدا اے دوست اپنے دل سے ہم

کٹ گئی اے بحرِ غم موجوں سے ہنستے کھیلتے
بہتے بہتے دیکھ آخر آ لگے ساحل سے ہم

حسن کے جور و تغافل کا بھی کس کو اعتبار
دل شکستہ ورنہ ہوتے تھے ذرا مشکل سے ہم

کیوں ٹھٹھک اٹھتے ہیں انجام محبت فراق
باخبر ہیں اس کے ہر آسان ہر مشکل سے ہم

۳۹

۱۹۳۶ء

کسی سے دُور رہ کر شادماں رہنے پہ مائل ہیں
مگر نیرنگیِ دردِ نہاں کے ہم بھی قائل ہیں

عجب کیا کھوئے کھوئے جو رہتے ہیں ترے آگے
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں غم اب حائل ہیں

نگاہِ ناز سَو سَو طرح سے ہے مہرباں لیکن
وہ تاثیرِ محبت کے نہ قائل تھے نہ قائل ہیں

وہ میرا درد ہے وحشت ہی جس سے اک زمانے کو
وہ تیرا حُسن ہے اہلِ دو عالم جس پہ مائل ہیں

یہ تیری چارہ سازی سر بسر اعجاز ہے لیکن
وہ دردِ لا دوا ہے جس کے اہلِ شوق گھائل ہیں

وہی آثارِ الفت تفرقہ پرداز بھی نکلے
جنھیں سمجھا کئے ملنے کے تیرے یہ وسائل ہیں

وہ لاثانی ہیں اُن کا اے دلِ خوں گشتہ کیا کہنا
نہایت خوبصورت ہیں نہایت خوش خصائل ہیں

یہ اُن کی بے رُخی برحق بجا کبر و غرور اُن کا
سراپا ناز ہیں گُل رنگ ہیں زہرہ شمائل ہیں

نہیں معلوم جو ہم بے خودوں کو اے جہاں والو
وہ کیا عقلی دلائل ہیں وہ کیا علمی مسائل ہیں

دو عالم ہو چکے ہیں اُن پہ اے شیخِ حرم صدقے
تجھے معلوم بھی ہے اہلِ دل کس در کے سائل ہیں
یہ اہلِ جور کے شکوے بجا یہ شکر بھی برحق
نہ قائل ہوں گے وہ ہرگز نہ قائل تھے نہ قائل ہیں
بہت کچھ ہے ابھی اے مہرباں جیبِ محبت میں
یہ مانا رنگِ رُخ، ہوش و حواس و صبر زائل ہیں
فرازِ طورِ سینا، بتکدے کعبے کے دروازے
ابھی راہِ محبت میں در و دیوار حائل ہیں
فراقؔ اُس سے بچھڑی ہے محبت الفت دیکھئے کیا ہو
معاون ساری باتیں ہیں موافق سب دلائل ہیں

۳۰

سنہ ۱۹۲۰ء

میں نے دیکھی ہیں یہ آنکھیں مستِ افسوں گر کہاں
ساقیا چھوٹا تھا میرے ہاتھ سے ساغر کہاں

یوں اُترتی جا رہی والی اے نگاہِ شرمگیں
ڈوب کر دیکھیں نکلتا ہے ترا نشتر کہاں

رہروانِ کوئے جاناں آہ اتنی ٹھوکریں
ہم نے بھی بے دست و پا ہو کے کیا بستر کہاں

اے جنوں اب حالِ گلزارِ خزاں دیدہ نہ پوچھ
وہ نسیمِ صبح کے جھونکے چمن پرور کہاں
یاد ہیں لبہائے جاناں کی تبسم ریزیاں
بات وہ تجھ میں بھلا موجِ مئے کوثر کہاں
خون تھا کلیوں کا دل بادِ صبا بیچین تھی
جلوۂ گلزار ڈوبے تھے ترے نشتر کہاں
جامِ دل کی تہ میں موجِ خوں سے اٹھ کر رہ گئی
اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں
آنکھیں بھر آتی ہیں اکثر پچھلی شب کے لیے فراق
وہ ادائیں چشمِ ساقی وہ بھرے ساغر کہاں

۱۳۱

۱۹۳۸ء

حجاب بے خبری کے اُٹھائے جاتے ہیں
تم آؤ ہوش میں دیوانے آئے جاتے ہیں
حریفِ انجمنِ دہر ہے ابھی شب گور
چراغ بزمِ عدم جھلملائے جاتے ہیں
نثار نشۂ و مستی یہ بزمِ غم ہے یہاں
بہت سنبھال کے ساغر اُٹھائے جاتے ہیں

نگاہِ مست کے دستِ کرم سے پیہم

فنا بقا کے خزانے لٹائے جاتے ہیں

وہ مستیاں ہوں کہ ہشیاریاں ہوں عشق میں بھی

تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

ابھی تو دامنِ گلزار رنگ پر بھی نہیں

ابھی سے دستِ جنوں تھرتھرائے جاتے ہیں

نظر کی چوٹ نہیں اوپری رگوں کے لئے

بچا بچا کے یہاں دل دکھائے جاتے ہیں

عدم کو درد ترا لے کے بیٹھتے جی سے

کہیں اجل سے یہ صدمے اٹھائے جاتے ہیں

وہ صاف عشق سے بے لاگ ہو کے آنکھوں
کوئی قسم سہی مگر اب بھی کھائے جاتے ہیں

ہوس ہے عشق سے ادنیٰ اک منزلِ بے نام
یہیں پہ کھوٹے کھرے آزمائے جاتے ہیں

اسے [illegible] ملا ہے مجھے اک سکونِ نامحسوس
حجابِ دردِ محبت اُٹھائے جاتے ہیں

نصیبِ عشق جہاں سو رہے ہیں موت کی نیند
وہیں اس آنکھ کے جادو جگائے جاتے ہیں

وہ قرب و بعد کی حد سے الگ تو ہیں لیکن
تمام عالمِ ہستی پہ چھائے جاتے ہیں

حوالیٔ زخمِ نہاں نشترِ نظر بھی نہیں
بہت سجا کے یہ چرکے لگائے جاتے ہیں

اُدھر ہے مقتلِ دنیا ادھر ہے مقتلِ عشق
جو بچ رہے تھے یہاں کام آئے جاتے ہیں

غمِ نہاں کے اشارے دلِ تیرے دیوانے
زمیں پہ نئی دنیا بسائے جاتے ہیں

مریضِ عشق کی بالیں پہ اور عالم ہے
اب اس مقام سے اپنے پرائے جاتے ہیں

کمالِ جذبِ کشش تھی کہ عاشقوں کو بھی
تصورِ شیریں دو دلوں میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز میں آتا چلا حجاب سا کچھ
یہیں سے شوق کے پہلو دبائے جاتے ہیں

کبھی کے یا بھی جھکے سر لیے کھلا بھی جھکے
ہم اُن سے آج بھی دامن چھڑائے جاتے ہیں

اُنھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا
جو گل چمن کو مٹا کر کھلائے جاتے ہیں

نہ راہ و رسم نہ اب کوئی عہد و پیماں ہے
وہ بے خود دل کو مگر یاد آئے جاتے ہیں

چمک گئی دلِ ہستی میں آج بجلی سی
جہاں میں نقشِ وفا یوں اُٹھائے جاتے ہیں

بہ ہر نظر نگہِ اولیں کی کیفیت
ارے یہ کب کے فسانے سنائے جاتے ہیں

غبارِ راہِ طلب اُٹھ کے بیٹھ بھی نہ سکا
فراقؔ ابھی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تو یاد بھی کر کے مجھے دل سے میرا نہ ہوا میرا نہ ہوا
میں تجھ کو بھلا کر بھی لیکن تیرا ہی رہا تیرا ہی رہا

۳۲

۱۹۳۸ء

کیوں بے قرار میری طبیعت ہے ان دنوں
بھولی ہوئی اگرچہ وہ صورت ہے ان دنوں

کیوں مجھ کو اک جہان سے وحشت ہے ان دنوں
سنتا ہوں مجھ کو تجھ سے محبت ہے ان دنوں

تجھ سے حیاتِ عشق نے اُف کیا اثر لیا
ہستی تمام شکر و شکایت ہے ان دنوں

وہ سامنے ہے آج خوشا بیخودیٔ دید
میں کہہ رہا تھا کیوں مجھے فرصت ہے ان دنوں

وہ آگ لگ گئی کہ دھواں ہے نہ آنچ ہے
در پردہ اس نظر کی شرارت ہے ان دنوں

کیوں داستان عمر گذشتہ نہ چھیڑیئے
اے دوست زندگی تو مصیبت ہے ان دنوں

وہ مائل کرم ہے میں امیدوار سا
یعنی نظر ملانے کی فرصت ہے ان دنوں

حیرت نہ کر ملول نہ ہو بدگماں نہ ہو
کچھ غیر اہل درد کی حالت ہے ان دنوں

میں اس قدر اُداس تو اس درجہ مہرباں
اے دوست شکرِ خوبیٔ قسمت ہے ان دنوں

بھولے ہوئے سے ہیں تجھے کچھ دردِ دل کو بھی
یک گونہ اہلِ عشق کو راحت ہے ان دنوں

بیگانہ وار پڑتی ہے ہر ایک پر نگاہ
بدلی ہوئی اُس آنکھ کی نیت ہے ان دنوں

سامانِ انقلابِ محبت ہے آج کل
کاوش میں وہ نگاہِ مروت ہے ان دنوں

لطف و ستم، تمنا و التجا سے ہوں بے نیاز
کس چیز کی نہ پوچھئے حسرت ہے ان دنوں

گم گشتگیٔ عشق تو خیر اور چیز ہے
کچھ کھوئے رہنے کی مجھے عادت ہے اِن دنوں

وہ پوچھتے ہیں وجہ سکوت و فسردگی
میں سوچتا ہوں کیا مری حالت ہے اِن دنوں

یوں تھر تھرا رہی ہیں رگیں کائنات کی
گویا قریب روزِ قیامت ہے اِن دنوں

فرق آگیا ہے دورِ حیات و ممات میں
کیا گردشِ نگاہِ محبت ہے اِن دنوں

جیسے پلٹنے کی بھی ادا ہو گریز میں
یہ قرب، یہ فراق، یہ شیت ہے اِن دنوں

دیکھی نہ تھی جنھوں نے کبھی صورت اُمید
اُن کو بھی تجھ سے چشمِ مروت ہے ان دنوں
اب کفر کے وہ رنگ نہ ایمان کے وہ طور
وہ عالمِ مجاز و حقیقت ہے ان دنوں
ہم بھی حریفِ زاہدِ شب زندہ دار ہیں
اُس نرگسِ سیہ سے ارادت ہے ان دنوں
ہر جلوہ اک جہانِ معانی ہے آج کل
اللہ کیا سے کیا تری صورت ہے ان دنوں
کیوں ملتیں نہ کفر کی سرسبز ہوں پھر آج
ذوقِ گناہ پیرِ طریقت ہے ان دنوں

گو بے نیاز ہیں وہ ہر اک حال سے مگر
اربابِ غم کو تیری ضرورت ہے اِن دنوں
واقف نہ تھے کبھی مژۂ خوں چکاں سے جو
اُن کا بھی اور رنگِ طبیعت ہے اِن دنوں
اس باب میں فراقؔ کئی ہیں روایتیں
خود مجھ کو اپنے حال سے غفلت ہے اِن دنوں
بیٹھے بٹھائے چپ نہیں لگتی تھی یوں مجھے
کیوں کیوں فراقؔ کیا تمہی حالت ہے اِن دنوں

۳۴

۱۹۳۷ء

غبارِ دل پریشاں دُور کینے ہوتے رہتے ہیں
مصفّا کیمیائے غم سے سینے ہوتے رہتے ہیں

سلامت سوزِ پنہاں کیوں دلوں کی فکر ہو تجھ کو
گداز اکثر یونہی یہ آبگینے ہوتے رہتے ہیں

دلوں کو رازِ ساحل بحرِ غم سکا ل ہی جاتا ہے
سراسر غرق اکثر یہ سفینے ہوتے رہتے ہیں

کریں کس طرح ظاہر عشق کی گستاخیاں اُس پہ
ادب کو سامنے جس کے پسینے ہوتے رہتے ہیں

جو سچ پوچھو تو آنا ہے نہ جانا ہے نہ ملنا ہے
یونہی مدت سے دن ہفتے مہینے ہوتے رہتے ہیں

زبانِ حال سے پیدا نئے اظہارِ مطلب کے
سلیقے ہوتے رہتے ہیں قرینے ہوتے رہتے ہیں

ہیں روشن تھرتھراتے اشک سے حلقے محبت کے
کہ نورِ چشمِ خاتم یہ نگینے ہوتے رہتے ہیں

ازل سے کھلتے جاتے ہیں نہاں خانے حقیقت کے
ابد تک عشق کو حاصل دفینے ہوتے رہتے ہیں

فراق اُس تک پہنچنے کے مدارج سے ہیں واقف ہوں
مگر زیر و زبر باہم یہ زینے ہوتے رہتے ہیں

۳۴ ؎

سنہ ۱۹۳۷ء

ادائے دلبری سے بھی بہانے ہوتے رہتے ہیں
نگاہِ شرمگیں سے بھی اشارے ہوتے رہتے ہیں

یہ برقِ طور کیا، ظلمات کیا، مہرِ قیامت کیا
یہاں دن رات ساقی یہ تماشے ہوتے رہتے ہیں

کرے گا ان کو رسوا، پردہ کرنا بھی حسینوں کا
نمایاں سو طرح یہ ماہ پارے ہوتے رہتے ہیں

؎ اس غزل میں جس طرح قافیے لائے گئے ہیں میں انہیں مستحسن نہیں سمجھتا۔
فراق

ازل سے تیری بزمِ ناز محوِ خوش کلامی ہے
سکوتِ چشم سے بھی کچھ فسانے ہوتے رہتے ہیں

ترے اہلِ جنوں کی وحشتوں کا یوں تو کیا کہنا
پیاپے ہوش بھی اُن کے ٹھکانے ہوتے رہتے ہیں

نگاہِ یار کا ہر وعدہ پورا ہو گیا، لیکن
دلِ بیتاب کے ابتک تقاضے ہوتے رہتے ہیں

بہارِ گلستاں کیا غفلتِ رنگیں عنادل کی
کہ نذرِ آتشِ گل آشیانے ہوتے رہتے ہیں

نہ فکرِ بادہ پیمائی نہ ذوقِ زندگی و مستی
یہ کیا کم ہے کہ ساقی سے اشارے اُٹھتے رہتے ہیں

تجاہل سے ہے تغافل سے ہے کشاکش ہے تکلف سے ہے
ادائے تو یہ تو سے وہ ہمارے ہوتے رہتے ہیں
زمانہ کروٹیں لیتا ہے اُس کے ہر اشارے پر
کہ وعدے ہوتے رہتے ہیں بہانے ہوتے رہتے ہیں
ازل سے انقلاب سر بسر ہے عشق کی ہستی
فراقؔ اُن کے اشارے سے اشارے ہوتے رہتے ہیں

خوش فہمیاں تمام غلط فہمیاں تمام
اِس عشق میں ہو گیا کوئی بدنام و نیک نام

۳۵

سنہ ۱۹۲۴ء

پڑتے ہی آنکھ تجھ پر جو یوں تڑپ اٹھا ہوں
دیکھا ہو جیسے پہلے پہچان سا گیا ہوں

دنیا کو میں سجا کر دنیا کو دیکھتا ہوں
بیگانہ وش جو اٹھے وہ چشم آشنا ہوں

اک وسعت نہاں ہوں اک موج بیکراں ہوں
کس دشت کی فضا ہوں کس باغ کی ہوا ہوں

کچھ کام عاشقی کے بگڑوں نے بھی سنوارے
ہیں قیس و کوہکن کی نقشہ یہ سوچتا ہوں

بس یہ دُعا ہے مالک آباد اس کو رکھنا!
جس بزم مے کشی سے آنکھیں بھرے اُٹھا ہوں

آگے ترے کسی سے کیا کیا نہ کہا سنتیں تھیں
منھ دیکھ کر کسی کا اللہ رہ گیا ہوں

اے جلوہ گاہِ جاناں اے منزلِ غریباں
کس رہ گذار میں ہوں میں کس دیار کا ہوں

کیفیتِ فنا ہوں دنیائے رنگ و بو میں
میخانۂ عدم میں جامِ جہاں نما ہوں

اے سوز و سازِ الفت اے تلخیٔ محبت
اکسیر بن گیا ہوں یا زہر ہو گیا ہوں

محشر میں ساتھ میرا اب چھوڑتے نہیں ہیں
اللہ یہ وہی ہیں جن کو ترس گیا ہوں

کیا رات تھی الٰہی آنکھوں میں کٹ گئی جو
پچھلے پہر کی دنیا حسرت سے دیکھتا ہوں

ہاں اے فراقؔ یونہی کچھ جی میں آ گئی تھی
یہ رازِ دل تھے جن کو باتوں میں کہہ گیا ہوں

۳۶[۱]

سنہ ۱۹۲۴ء

تم ہو جہاں کے شاید میں بھی وہیں رہا ہوں
کچھ تم بھی بھولتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں

مٹتا بھی جا رہا ہوں پورا بھی ہو رہا ہوں
میں کس کی آرزو ہوں میں کس کا مدعا ہوں

سب سے بڑا گنہ ہے معصومیِ محبت
اب بخش یا سزا دے مجرم ہوں بے خطا ہوں

[۱] اس غزل کے کچھ اشعار سنہ ۱۹۲۷ء میں کہے گئے۔ فراق

کیفِ فنا بھی مجھ میں، شانِ بقا بھی مجھ میں
میں کس کی ابتدا ہوں، میں کس کی انتہا ہوں

منزل کی یوں تو مجھ کو کوئی خبر نہیں ہے
دل میں کسی طرف کو کچھ سوچتا چلا ہوں

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں یہ بھی خبر نہیں ہے
میں کیا کہوں کہاں ہوں، میں کیا بتاؤں کیا ہوں

دردِ فراقِ جاناں، سوز و گدازِ پنہاں
آرام دے رہے ہیں آرام پا رہا ہوں

لیتی ہیں اُلٹی سانسیں جب شامِ غم فضائیں
اُس دم فنا بقا کی میں نبض دیکھتا ہوں

ہوں وہ شعاعِ فردا جو آنکھ مل رہی ہے
وہ سرمگیں افق پہ میں تھرتھرا رہا ہوں
ہوں موجِ آبِ حیواں اُٹھتا ہوں خون ہو کر
میں دردِ زندگی ہوں اور دردِ لا دوا ہوں
جس سے شجر حجر میں اک روح دوڑ جائے
وہ سازِ سرمدی میں غزلوں میں چھیڑتا ہوں
میں اسے فراقؔ حسنِ دوشیزۂ ازل کی
معصومیِ نظر ہوں، میں عشق کی خطا ہوں

۳۷

سنہ ۱۹۳۱ء

لاکھ محرومِ سے بار ہیں سے بیزار سے ہیں
لیکن امیدیں بھی تیرے کیے انکار سے ہیں

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں

بجلیاں ٹوٹ رہی ہیں نگہِ ساقی سے
چشمکیں موجِ مئے ساغرِ سرشار سے ہیں

مدتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

یوں تو غربت میں بھی سر پیٹتے ہیں تیرے اسیر
یوں تو کہنے کو یہاں بھی در و دیوار سے ہیں

کچھ نہ جیتے ہی ہیں رکھا ہے نہ مر جاتے ہیں
کام جتنے بھی محبت کے ہیں بیکار سے ہیں

تو تو نادم نہ کر اے یار کہ تجھ پر مٹ کے
خود ہم اپنی ہی نگاہوں میں گنہگار سے ہیں

شاد و آباد ہیں اے دوست محبت میں ہم

ہم بیکسی سے ہیں بیدل سے ہیں بیزار سے ہیں

صلح کل حسن کی چڑھی تیوریوں پہ صدقے ہو

معرکے آج اسی آمادۂ پیکار سے ہیں

اُف رے اشاراتِ نہاں سے وہ پگھلانا دل کا

کیا کریں دیدۂ مخمور خریدار سے ہیں

آہ! بیداد تشنہ دلوں بعد تری پرسشِ غم

شکوے اک غیر کے اپنے دلِ بیزار سے ہیں

کہہ دیا تو نے جو معصوم تو معصوم ہیں ہم

کہہ دیا تو نے گنہگار گنہگار سے ہیں

ہم نظر باز وہاں کے ہیں کہ آئینہ کو بھی
تیرے دیدار جہاں حسرتِ دیدار سے ہیں

سرفروشانِ محبت پہ ہیں احساں تیرے
تیرے ہاتھوں پہ سبکدوش گرانبار سے ہیں

خیر خوش ہولے اشاراتِ نہاں سے کوئی روز
آشنا ہم بھی کچھ اے دل نگہِ یار سے ہیں

لبِ جاں بخش کے اعجاز سے انکار نہیں
کچھ اشارے بھی مگر نرگسِ بیمار سے ہیں

شکوۂ جور و تقاضائے کرم سب بے سود
کیوں مگر پردۂ انکار میں اقرار سے ہیں

وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی دل ہے لیکن
کچھ نہ کچھ سب کے بدلتے ہوئے آثار سے ہیں
جس کو دکھنے کی طرح آئے نہ دکھنا بھی فراقؔ
تنگ آئے ہوئے ہم تو دلِ بیمار سے ہیں

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

۳۸

۱۹۳۴ء

بستیاں ڈھونڈ رہی ہیں انھیں ویرانوں میں
وحشتیں بڑھ گئیں حد سے ترے دیوانوں میں
نگہ ناز نہ دیوانوں نہ فرزانوں میں
جان کار ایک وہی ہے مگر انجانوں میں
بزم سے بے خود و بیتاب نہ کیوں ہو ساقی
موج بادہ ہے کہ درد اٹھتا ہے پیمانوں میں

ہیں تو میں چونک اُٹھی ہے یہ فضائے خاموش
یہ صدا کب کی سُنی آتی ہے پھر کانوں میں
وسعتیں بھی ہیں نہاں تنگیِ دل میں غافل
جی بہل جاتے ہیں اکثر انھیں میدانوں میں
جان و ایمانِ جنوں سلسلہ جنبانِ جنوں
کچھ کششہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں
خندۂ صبحِ ازل تیرگیِ شامِ ابد
دونوں عالم ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
دیکھ جب عالمِ ہُو کو تو نیا عالم ہے
بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے"

گرمیاں ہیں کچھ ابھی سوختہ سامانوں میں

وحشتیں بھی نظر آتی ہیں سرِ پردۂ ناز

دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں

ایک رنگینیٔ ظاہر ہے گلستاں میں اگر

ایک شادابیٔ پنہاں ہے بیابانوں میں

یہ جو ہر غنچہ و گل میں ہے اک اندازِ جنوں

کچھ بیاباں نظر آئے ہیں گریبانوں میں

اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گل بھی نہ رہے

اب وہ آثارِ جنوں بھی نہیں دیوانوں میں

اب وہ ساقی کی بھی آنکھیں نہیں رندو تیرے
اب وہ ساغر بھی چھلکتے نہیں میخانوں میں

اب وہ اک سوزِ نہانی بھی دلوں میں نہ رہا
اب وہ جلوے بھی نہیں عشق کے کاشانوں میں

اب وہ رات جب امیدیں بھی کچھ تھیں تجھ سے
اب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں

اب ترا کام ہے بس اہلِ وفا کا پانا
اب ترا نام ہے بس عشق کے غمخانوں میں

تا بکے وعدۂ موہوم کی تفصیل فراق
شب فرقت کہیں کٹتی ہے ان افسانوں میں

۳۹

۱۹۳۷ء

عشق کی بیتابیوں میں سوزِ پنہاں کچھ نہیں
اس ہوا میں یہ چراغِ زیرِ داماں کچھ نہیں

کیا ہے دیکھو حسرتِ سیرِ گلستاں کچھ نہیں
کچھ نہیں اے ساکنانِ کنجِ زنداں کچھ نہیں

عشق کی ہے خودنمائی عشق کی آشفتگی
روئے تاباں کچھ نہیں زلفِ پریشاں کچھ نہیں

یاد آ ہی جاتی ہے اکثر دلِ برباد کی

یوں تو ہیچ ہے چند ذراتِ پریشاں کچھ نہیں

عشق سے جو کچھ بنا ہے وہ ہے گرمیٔ بازارِ حسن

اہلِ دل کا سوزِ پنہاں کچھ نہیں ہاں کچھ نہیں

اور ان کی زندگی ہے اک عنوانِ حیات

خود فراموشوں کو تیرے عہد و پیماں کچھ نہیں

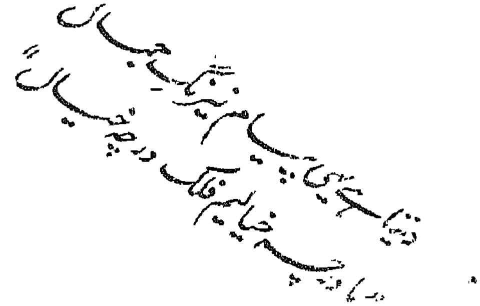
ایک ہو جائے نہ جب تک سرحدِ ہوش و جنوں

ایک ہو کر چاک دامان و گریباں کچھ نہیں

جو نہ ہو جائے وہ کم ہے جو کبھی ہو جائے بہت

کارزارِ عشق میں دشوار و آساں کچھ نہیں

دیکھنی تھی دیکھ لی اس چھیڑ کی بھی سادگی
بے دلوں میں یہ تبسم ہائے پنہاں کچھ نہیں
کاش اپنے درد سے بیتاب ہوتے اے فراق
دوسرے کے ہاتھوں یہ حالِ پریشاں کچھ نہیں



۴۰

۱۹۳۵ء

انا لیلیٰ کے نعرے گونجتے ہیں گنج محمل میں
بھلا کیا گھر کرے کوئی دل دیوانۂ دل میں

خودی نے میری ہستی کو بنایا وادیِ غربت
انھیں وہموں کے ہاتھوں دور پہنچا منزل سے منزل میں

سبک رفتار ہے یوں تو نسیم صبح گاہی بھی
مگر ہے اور بات اسے دل خرام ناز قاتل میں

اڑتی ہے نسیمِ صبح خوفِ خونِ ناحق سے
رنگی ہے ہر گلِ تر کی قبا خونِ عنادل میں

کشیدہ دل سے سینہ تیرِ حسرت گزار اچھتا ہے
یہ کس گل کی الٰہی نکہت برباد تھی دل میں

یہ کیا ڈوبیں گے بحرِ عشق کی یہ تھاہ کیا لیں گے
کسی کے پاس دل بھی ہے سبکسارانِ ساحل میں

اشارے سے جنوں کے چل رہے ہیں تیرے زندانی
عجب بے ساختہ پن آج ہے شورِ سلاسل میں

بیانِ خونِ دل ہے ایک عالم پہ ہے سناٹا
سناتا ہوں یہ افسانہ زبانِ تیغِ قاتل میں

ہم اہلِ انجمن سے پوچھ اُسے جو ربطِ پنہاں ہے

ہمارے قلبِ سوزاں میں گدازِ شمعِ محفل میں

کوئی دل چھوڑ کر جاتا ہے کر لو صبر جانے دو

تمھیں آ کر فراقؔ اب بس رہو اس اُجڑی محفل میں

۱۴

۱۹۳۶ء

جنونِ کارگر ہے اور میں ہوں
حیاتِ بے خبر ہے اور میں ہوں

کہاں میں آگیا اے زورِ پروانہ
وبالِ بال و پر ہے اور میں ہوں

نگاہِ اولیں سے ہو کے برباد
تقاضائے دگر ہے اور میں ہوں

مبارک یادِ ایامِ اسیری
غمِ دیوار و در ہے اور میں ہوں

یہ سارا حسن کی نیرنگیاں ہیں

عشقِ وحشت اثر ہے اور میں ہوں

سکوتِ ناز سے پُر اک تکلم سا

جوابِ مختصر ہے اور میں ہوں

تری جنبشیں ہیں اور تو ہے

طوافِ در بدر ہے اور میں ہوں

کوئی ہو شستہ بیانی تو یوں ہو

پیامِ بے اثر ہے اور میں ہوں

نگاہِ جاں ستاں ہے اور رگِ جاں

کمالِ چارہ گر ہے اور میں ہوں

تغافل حسن کا ہے اور تو ہے
نصیب بسر و در ہے اور میں ہوں
مٹے ہنگامۂ عشق فغاں سنج
غم بے شور و شر ہے اور میں ہوں
نگاہ بے حیا تیرے صدقے
کئی ٹکڑے جگر ہے اور میں ہوں
ٹھکانا ہے کچھ اس عذر ستم کا
تری نیچی نظر ہے اور میں ہوں
فراق ایک ایک حسرت مٹ رہی ہے
یہ ماتم رات بھر ہے اور میں ہوں

۴۳

سنہ ۱۹۳۷ء

عشق کو میرے کبھی قرار نہیں
نیستی کا بھی اعتبار نہیں

آ کے جا سکے جو وہ بہار نہیں
نشۂ عشق میں خمار نہیں

میں بھی کوئی ادا ہوں کیا تیری
مجھ کو اک حال پہ قرار نہیں

میں گریباں پکڑ کے یوں روؤں
اے جنوں تیرا اعتبار نہیں
دل کو صدمے ہوا ہی کرتے ہیں
ہاں مگر تیری شرمسار نہیں
کھینچ دیتا جنوں کی اک تصویر
ہاتھ میں دامن بہار نہیں
یوں تو میں بھی نہیں کوئی غم دوست
یوں تو تم بھی ستم شعار نہیں
کوئی ان کا مزاج پا نہ سکا
اُن نگاہوں کا اعتبار نہیں

دے پیامِ حیات اور کہ عشق
قائل جبر و اختیار نہیں

بیخودی سی ہے بیخودی اے عشق
مجھ کو اپنا بھی انتظار نہیں

تیرے آنے کی کیا امید مگر
کیسے کہہ دوں کہ انتظار نہیں

ایک بھی تو نہیں ہے مستِ شراب
کوئی دنیا میں ہوشیار نہیں

ٹھہری ٹھہری سی جیسے برقِ خیال
نگہِ یار سے قرار نہیں

حسن کو میں نے کب دیا الزام

عشق بھی تو قصور وار نہیں

ہجر اور وصل ایک سے ہیں فراق

حسن کا بھی کچھ اعتبار نہیں

میں زندگی سے اتنا تھا کب آشنا اور س

مرے رنج ان آنکھوں سے پیا جو جا کا گیا

۳۴[1]

سنہ ۱۹۱۹ء

سہانی رات ہے چھٹکے ہوئے ستارے ہیں
سکوتِ نیم شبی کے لطیف اشارے ہیں

جنوں میں یہ دلِ بیتاب کے اشارے ہیں
کہ مہر و ماہ اسی برق کے شرارے ہیں

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتے ہیں
اُنھیں سے سنتے ہیں افلاک چال ہارے ہیں

[1] یہ غزل سنہ ۱۹۲۴ء میں مکمل ہوئی۔ فراق

قفس نصیبوں سے آنکھیں چُرا نہ بادِ صبا
چمن سے دُور ہیں جیتے ترے سہارے ہیں

نہ بے خبر تھے نہ ہشیار تاب تھی نہ قرار
نہ پوچھ عشق کے دن کس طرح گزارے ہیں

یہ کیا ہم اہلِ زمیں کی بنائیں گے تقدیر
کہ خود منجمِ فلک قسمتوں کے مارے ہیں

تمام قامتِ رنگیں ہے خوابِ کاہکشاں
یہ پیکرِ عرق آلود کے ستارے ہیں

یہی ادائے حیا جان ہے محبت کی
جو نیچی نظروں سے کہتی ہے ہم تمہارے ہیں

فراقؔ اُن پہ بھی کیا کیا گماں گزرتا ہے
مری نظر میں جو حور و پری سے پیارے ہیں

قدرِ دل کیا ہے کھلا آج ترے لڑنے پر
تجھ سے اتنی تھی محبت مجھے معلوم نہ تھا

یہ نئی زبان میں تھوڑے سے دنوں سے ترقی
انکا کے حصہ بھی تجھ سے جا کے سیکھی بھی تجربے

۴۴

سنہ ۱۹۲۷ء

نہ جانے کیا ہے ساقی مے پرستوں کے مقدر میں
سراسر گردشِ افلاک کا عالم ہے ساغر میں

محبت نے فسانہ کر کے چھوڑا رہتی دنیا کو
بھرے کیفِ عدم عالم کے رنگا رنگ منظر میں

وہ گم گشتہ تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی
پکار آئے دلِ برباد کو ہم کوئے دلبر میں

نہ کھولی آنکھ تم نے بادۂ ہستی کے متوالو
سمٹی اک جاتی ہوئی دنیا یہاں ایک ایک منظر میں

نہ ہو احساس تو سارا جہاں ہے بےحس و مُردہ
گدازِ دل ہو تو دُکھتی رگیں ملتی ہیں پتھر میں

نشیمن جل رہے ہیں ہر چمن شعلہ بداماں ہے
یہ کس نے بجلیاں رکھ دی تھیں ہر برگِ گلِ تر میں

پیامِ مرگ بے ہنگام ہے یا دل ہے پہلو میں
میں کس کے ساتھ جاتا ہوں حریمِ نازِ دلبر میں

کچھ اس سے رہروانِ عشق کو وابستگی سی ہے
وہ زعمِ رہنمائی دیکھتے جاتے ہیں رہبر میں

تجھے دیکھیں مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے
یہی اک رازِ پنہاں تھا طلوعِ صبحِ محشر میں

دلِ غمگیں ذرا آواز دینا عمرِ رفتہ کو
یہ حسرت آج کیسی ہے نگاہِ نازِ دلبر میں

یہ سازِ دل، گدازِ دل، یہ گرمی، یہ گرانباری
ہوا میں ہے نہ پانی میں نہ آتش میں نہ پتھر میں

ہمیں ہیں زندہ درگور اور ہمیں ہیں زندۂ جاوید
نہ بختِ خضر میں یہ ہے، نہ تقدیرِ سکندر میں

یونہی کچھ بے قراری میکشوں کی کم نہ تھی ساقی
چھری سی آج کیوں کھنچ کھنچ کے رہ جاتی ہے ساغر میں

چھڑا اس رنگ سے افسانۂ بیدردیِ قاتل
شہیدِ ناز کو نیند آ گئی آغوشِ خنجر میں
صدائے آہ آہ دل سے اٹھی خیر ہو یا رب
فنا کے راز پنہاں ہیں خرامِ نازِ دلبر میں
گدازِ انجمن میں اک درماندگی کا کیف عالم میں
فراق ایسی کہاں سے شامِ غم سب کے مقدر میں

آج رگ رگ میں جان دوڑ گئی
موت نے زندگی کو چھیڑ دیا

۴۵

۱۹۳۳ء

ترے وحشی بھری دنیا کو ویرانا سمجھتے ہیں
مگر ایک ایک ذرّہ کو بھی اک دنیا سمجھتے ہیں

نہ ہم ایسا سمجھتے تھے نہ ہم ایسا سمجھتے ہیں
مگر کیا جانئے سب لوگ تجھ کو کیا سمجھتے ہیں

طلسم رنگ و بو کو اہل دل کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی دھوکا کبھی پردا کبھی جلوا سمجھتے ہیں

چھپا رکھا ہے تجھ سے وسوسوں نے وصل و فرقت کے

انھیں وہموں سے اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

چھپا بھی کچھ نہیں رہتا نظر بھی کچھ نہیں آتا
اسی کو ہم ترا دیدار ہو جانا سمجھتے ہیں

اب اتنی بھی نہیں بہکی مری بہکی ہوئی باتیں
جنھیں بے وقت، بے تک، بے محل بیجا سمجھتے ہیں

مثال بے مثالی ہے زمانے سے نرالی ہے
کسی کی سادگی کو لوگ جانے کیا سمجھتے ہیں

کسی کا پوچھنا کیا کام ہم کو گھر بلا لیتے ہیں
کوئی ہم سے نہ پوچھے اب ہم اس کو کیا سمجھتے ہیں

ا کسی سے محبت کا آغاز میری زندگی میں یوں ہوا۔ (فراق)

ہمیں مایوسیِ فرقت میں رو لینے دو جی بھر کے

نہیں ہوتا ہے کچھ رونے سے ہم اتنا سمجھتے ہیں

کسی کے جینے والے جی رہے ہیں اور عالم میں

سکوں کیا ہے کسے بیتاب ہو جانا سمجھتے ہیں

وہی جو تنگنائے زیست میں کچھ وسعتیں بھی ہیں

انھیں کو اصطلاحِ عشق میں صحرا سمجھتے ہیں

ہمارا حال سننے والے تیرے ضبط کے صدقے

یہ رہ رہ کے ترا ہم مسکرا دینا سمجھتے ہیںلہ

لہ۔ آگرہ جیل میں جب میں سیاسی قیدی تھا تو محبوبہ کے بعد ملاقات آنے کے عالم کی داخلی و خارجی مصوری اس شعر میں کی گئی ہے

فراق

جہانِ رنگ و بو بس چند ذرات پریشاں ہیں
بھرے گلزار کو اہلِ نظر صحرا سمجھتے ہیں
سبھی کے ساتھ ہیں سب کے شریکِ شادی و غم ہیں
تو سب سے بے صبر آخر صبر کر لیتا سمجھتے ہیں
یہ کوئی منصفی ہے تجھ کو الزامِ جفا دینا
نہ جانے غمگسارِ عشق تجھ کو کیا سمجھتے ہیں
فراق اکثر کوئی ہر اک سے بیگانہ سا رہتا ہے
بس اتنے پر کسی کو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں

۴۶

سنہ ۱۹۳۳ء

تمھیں کیونکر بتائیں زندگی کو کیا سمجھتے ہیں
سمجھ لو سانس لینا خودکشی کرنا سمجھتے ہیں

کسی بدمست کو راز آشنا سب کا سمجھتے ہیں
نگاہِ یار تجھ کو کیا بتائیں کیا سمجھتے ہیں

بس اتنے پر ہمیں سب لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں
کہ اس دنیا کو ہم اک دوسری دنیا سمجھتے ہیں

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے مل جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

امیدوں میں بھی ان کی ایک شانِ بے نیازی ہے
ہر آسانی کا جو دشوار ہو جانا سمجھتے ہیں

یہی ضد ہے تو خیر آنکھیں اُٹھاتے ہیں ہم اُس جانب
مگر اے دل ہم اس میں جان کا کھٹکا سمجھتے ہیں

کہیں ہو تیرے دیوانے ٹھہر جائیں تو زنداں ہے
جدھر کو منہ اُٹھا کر چل پڑے صحرا سمجھتے ہیں

جہاں کی فطرتِ بیگانہ میں جو کیفِ غم بھر دیں
وہی جینا سمجھتے ہیں وہی مرنا سمجھتے ہیں

ہمارا ذکر کیا ہم کو تو ہوش آیا محبت میں
مگر ہم قیس کا دیوانہ ہو جانا سمجھتے ہیں

نہ شوخی شوخ ہے اتنی نہ پُرکاری اتنی پرکاری
نہ جانے لوگ تیری سادگی کو کیا سمجھتے ہیں

بھلا دیں ایک مدت کی جفائیں اُس نے یہ کہہ کر
تجھے اپنا سمجھتے تھے تجھے اپنا سمجھتے ہیں

یہ کہہ کر آبلہ پا روندتے جاتے ہیں کانٹوں کو
جسے تلوؤں میں کر لیں جذب اُسے صحرا سمجھتے ہیں

یہ ہستی نیستی سب موج خیزی ہے محبت کی
نہ ہم قطرہ سمجھتے ہیں نہ ہم دریا سمجھتے ہیں

فراقؔ اس گردشِ ایّام سے کب کام نکلا ہے
سحر ہونے کو ہم بھی رات کٹ جانا سمجھتے ہیں

٨٧

١٩٢١ء

تقدیر سہی اور تدبیر سہی جب تقدیر نہیں تدبیر نہیں
پھر جو بھی ہو میرے حصے میں تدبیر نہیں یا تقدیر نہیں

یہ راز و نیاز حسن و عشق ہیں وصل کہاں فرقت کیسی
ہے کارگر اس میں اور ہی کچھ تدبیر نہیں تقدیر نہیں

یہ گردش دوراں اے ساقی ہے کس کی لغزش مستانہ
گردش کا سبب تدبیر نہیں لغزش کا سبب تقدیر نہیں

ہم دیکھ چکے ہم جان چکے ہم ایسوں کو پہچان چکے
ہونی بھی سہی تقدیر مگر ایسی ہونی تقدیر نہیں

کمیاب سہی نایاب سہی گمنام سہی بے نام سہی
تاثیر محبت کچھ بھی سہی پر کیا وہ دعا عالمگیر نہیں

کیوں چوٹ نہ دل کی ابھر آئے کیوں زنداں یاد نہ آجائے
کیا موج ہوائے بہار چمن لہرائی ہوئی زنجیر نہیں

اکثر راتوں کو یہ کہہ کر اک درد کا مارا روتا ہے
سچ ہے کہ محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تقصیر نہیں

مانا کہ نگاہ بھی قاتل تھی مانا کہ اٹھی بھی تیری طرف
یہ حال ہوا جس سے اے دل ایسا بھی تو مارا تیر نہیں

جب دونوں باہم روٹھ چکے ہیں تب کہیں یہ راز کھلا
تقصیر مری تقصیر نہیں تقصیر تری تقصیر نہیں

شبنم نے بھریں ٹھنڈی آہیں دل خون ہوا ہر غنچہ کا
کیا اُٹھتے درد کے عالم کی ہر موج صبا تصویر نہیں

ذراتِ پریشاں پر دل کے لئے مہر و ماہ اک عالم ہے
اور یوں تو چمکنے کو چمکی کس ذرے کی تقدیر نہیں

امید پہ جیتی ہے دنیا ہم ایسوں کا جینا رہ جانا
اے پوچھنے والے اس کے سوا کچھ بگڑی ہوئی تقدیر نہیں

اک درد بھری آواز نئی پیہم تن کو رُلاتی ہے
یہ طرزِ فراق سے بہتر نکلی کوئی کہہ دے طرز بہتر نہیں

۴۸

۱۹۴۵ء

ہوش رہتے جو سبو، پیمانۂ دل بھر نہ سکیں

تجھ سے اے جوش جنوں یاد تری کر نہ سکیں

چھینٹے دامن کی جبینوں میں ہے یہ ہی کافی

کچھ نہیں کہہ کے بھی پھر کہیں مست بکھر نہ سکیں

کچھ تو کوشش کیا ہو جو بھی نہیں پا سکے خواب

وہ نگہ کر نہ سکے ہی کیوں لیں کہ جیسے کر نہ سکیں

یہ نگاہِ غلط انداز بھی کیا غضب ہے دوست

دیکھنے والے ترے جی نہ سکیں مر نہ سکیں

عمر بھر کا بھی جسکا دست کو اسکے ساقی

تہمتیں ایسی بھی کچھ ہیں جو کبھی مٹ نہ سکیں

ہوسکے کچھ بھی جتنے ہیں ستم ان کے لیکن

اسقدر آزادہ رو ہو جائیں کہ کچھ کر نہ سکیں

کچھ اگر دل سے خفا ہیں تو خفا ہے ساقی

دوست بھی ان کی نگاہوں سے تو یہ مر نہ سکیں

۴۹

۱۹۳۹ء

اُسے کس بات کا شعور نہیں
چشمِ مخمور اِتنی چور نہیں

تیری شیرینگی طبیعت سے
عشق کی سادگی بھی دُور نہیں

سب کو ملتی نہیں یہ شدتِ ہوش
دل سوزاں چراغِ طور نہیں

جتنا دنیا نے مان رکھا ہے
اس قدر فرقِ نار و نور نہیں
جو رگِ جاں سے بھی ہے بڑھ کے قریب
کیوں سمجھتے اس کا دور دور نہیں
منزلِ دوست پہ ٹھہر جانا
مسلکِ قلبِ ناصبور نہیں
حسنِ محبوب کو بھی کیا کہئے
میری آنکھوں کا بھی قصور نہیں
عشق میں خوش بھی ہوتے ہیں لیکن
ایسا ہونا بھی کچھ ضرور نہیں

خبر اپنی نہ آج تک آئی
ارے میں اس قدر تو دُور نہیں
اتفاقات ہیں زمانے کے
ورنہ کچھ اہلِ غم سے دُور نہیں
عشق کرنا گناہ ہے کہ ثواب
کچھ میسر ہونے کے اصول نہیں
حسرتِ مرگِ عشق ہے ان کو
جنھیں جینے کا بھی شعور نہیں
اہلِ دل کو خراب رہنے دے
تیری آنکھوں سے تو یہ دُور نہیں

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ
کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں
اے فراق انقلاب عالمگیر
وقت کی مصلحت سے دُور نہیں

تری جفائیں بھلا دوں تری وفائیں بھی
جب یاد آئے تو اے دوست کوئی یاد آئے

۵۰

۱۹۴۳ء

اُنھیں رہ رہ کے اب آواز دیتی ہیں نئی راہیں
پرانی ہو گئیں اہلِ طریقت کی گزرگاہیں!

محبت کی مصیبت میری جاں المختصر یہ ہے
وہی ہم دونوں چاہیں پہ لجنوان دگر چاہیں

دلِ ہر قطرۂ شبنم بھر آیا بات اتنی تھی
کلی کے مسکرانے میں سنائی دے گئیں آہیں

انھیں کی بے حسی پر سنگ و آہن کو بھی حیرت ہے
تصور سے کسی کے تھرتھرا اٹھتی تھیں جو بانہیں

جنھیں موجِ نسیمِ صبح گاہی ہم سمجھتے تھے
حقیقت سے کبھی دل کو چیرتی جاتی ہیں وہ آہیں

یہیں سے بستیاں ابھریں یہیں سے رفعتیں چمکیں
نہ پوچھو ہم سے اے ارض و سما ہم کون ہیں کیا ہیں

زمیں کی منزلوں سے آشنا ہونا مبارک ہو
کہ خود افلاک کی راہوں سے مل جاتی ہیں یہ راہیں

فراقؔ اس دکھ بھری دنیا کو تو نے جانے کیا سمجھا
اگر یوں دیکھتی آنکھیں درِ فردوس بھی وا ہیں

کبھی کبھی تجھے جب آنکھ اٹھا کے دیکھا تھا

حجاب عمر لیا تھا کھ دو نیم سے لمحے کبھی

جہاں مٹا نہ سکا ہے جو ازل اپنے سہارے

یہ عشق وہی درد اٹھانے کے لئے ہے

ہوئی ہیں اس کی سحر جب ملی تو ہنستی

سر دیدہ پیکہ اب ہیں اور اس پہ تنہایاں

۵۱

۱۹۳۸ء

بیخودی میں اک تماشہ سی بھی تو ہوا ایسا نہیں

تو نہ آئے یاد لیکن میں تجھے بھولا نہیں

عشق میں شامل وہ کیفیت وہ رنگینی تو ہو

درد کا اٹھنا نگاہِ ناز کا اٹھنا نہیں

حسن کی بیگانگی پر یہ دورِ ستم کیا

دل میں لیکن سوچئے تو عشق خود اپنا نہیں

ایسی بھی کیا احتیاطیں اے نگاہِ شوخِ یار
گدگدانا، مسکرانا، تیرے بس میں کیا نہیں

ہوش ہو، جوشِ جنوں ہو، غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اس بزم میں چھلکا نہیں

جلوہ دارِ حسن آئینۂ رنگِ سکوت
لب کشائی پہ حقیقت کا بھرم کھلتا نہیں

عشق جو چاہے کہے تیرے نہ سننے کو مگر
تجھ سے جو کہتا ہے کوئی رازِ بھی ایسا نہیں

یوں کبھی آتی ہے قیامت اے خرامِ نازِ یار
مٹ کے بھی دنیا محبت کی تہ و بالا نہیں

ایک حالت پہ نہ زمانے میں نہ گزری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دنیا نہیں

اک جہاں لاکھوں فسانے عشق سر تا پا سکوت
درمیاں رسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

جس کے شعلوں سے تھی کل تک گرمیِ بزمِ حیات
آج اُس خاکسترِ دل سے دُھواں اٹھتا نہیں

عشق کی بھی زندگی میں انقلاب آ ہی گیا
آج اُس کو، بیکہ کر دل کا شگوں دیکھا نہیں

تفرقوں سے پاک ہیں آنسو محبت کے فراق
حسن سر تا پا تغافل دوست و دشمن کا نہیں

۵۲

سنہ ۱۹۳۰ء

دھیان آنکھ پھیرنے کے بھی آئے ہوئے سے ہیں
یہ نقش بھی تو دل میں بٹھائے ہوئے سے ہیں

بادل سے اہلِ دل پہ جو چھائے ہوئے سے ہیں
اگلے زمانے یاد کچھ آئے ہوئے سے ہیں

مرہونِ احتمالِ تسلسل ہے حیاتِ عشق
روکے ہوئے ستم بھی تو ڈھائے ہوئے سے ہیں

بس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر ابھر نہ آئیں
وہ نقشِ آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں

تلوار سی جو تابشِ پنہاں ہے حسن کی
عشاق بھی لہو میں نہائے ہوئے سے ہیں

وہ درد کی طرح سے اُٹھے فتنہ ہائے حشر
یہ بھی کسی کے ناز اُٹھائے ہوئے سے ہیں

جا ہم نے تجھ کو دیکھ لیا اے نگاہِ یار
مسرور مست دل بھی دکھائے ہوئے سے ہیں

غم ہے کہ انتظار و سکوں ہے کہ اضطراب؟
آئے ہوئے بھی وقت نہ آئے ہوئے سے ہیں

آگے ترے فقط ہے یہ نذرِ و نیازِ عشق
خود کو تری نظر سے چھپائے ہوئے سے ہیں

تقریبِ دید ہیں غمِ ہجراں کی شدتیں
محسوس ہو رہا ہے وہ آئے ہوئے سے ہیں

دیتی ہے وہ نگاہ اگر درسِ نیستی
ہم بھی متاعِ زیست لٹائے ہوئے سے ہیں

کیونکر ہو احتیاطِ نظر اُن کے سامنے
ہم کھوئیں یا نہ کھوئیں وہ پائے ہوئے سے ہیں

جلوہ نمائیوں میں جھجک کیا، حجاب کیا؟
انداز تیرے حسن کے بھائے ہوئے سے ہیں

جانِ نشاط بھی ہیں خزاں دیدگانِ عشق
کچھ شوخیِ بہار اُڑائے ہوئے سے ہیں

جو حسن بھی نہ سمجھے حیا والے ناز کو
وہ عشوۂ نہاں بھی سکھائے ہوئے سے ہیں

گویا ازل کے دن سے جہاں دیدگانِ عشق
دنیا کے سرد و گرم اُٹھائے ہوئے سے ہیں

اکثر سکوتِ بحر میں گر غور سے سنیں
آتی ہیں یہ صدائیں ہم آئے ہوئے سے ہیں

ہم بدگمانِ عشق بھی کچھ اے سکوتِ ناز
سنتے ہیں تیری باتوں میں آئے ہوئے سے ہیں

بہلا رہے ہیں عشق کے احساس کو فراق

دل سے کسی کی یاد بھلائے ہوئے سے ہیں

[illegible]

[illegible]

۵۳

۱۹۳۴ء

ہو کر عیاں وہ خود کو چھپائے ہوئے سے ہیں
اہلِ نظر یہ چوٹ بھی کھائے ہوئے سے ہیں

اہلِ وفا دلوں کو بسائے ہوئے سے ہیں
دونوں جہاں کے درد اٹھائے ہوئے سے ہیں

رازِ آشنائے کیفِ فنا ہیں چراغِ دل
جھلملانے والے بجھائے ہوئے سے ہیں

یہ مہر و ماہ گردِ سرِ راہ ہیں جہاں
ہم اُس گلی کی خاک اُڑائے ہوئے سے ہیں

ذوقِ نظر حدودِ فنا سے بڑھائیے
اہلِ ہوس بھی خود کو مٹائے ہوئے سے ہیں

وہ طور ہو کہ حشرِ دلِ افسردگانِ عشق
ہر انجمن میں آگ لگائے ہوئے سے ہیں

صبحِ ازل کو یونہی ذرا مل گئی تھی آنکھ
وہ آج تک نگاہ چرائے ہوئے سے ہیں

اک لرزشِ خفی بھی ہے تمکینِ حسن میں
رُکے ہوئے بھی تیر چلائے ہوئے سے ہیں

رسوائے دہر جب سے کیا ضبطِ عشق کو
ہم آج تک وردِ دوبائے ہوئے سے ہیں

گویا سنے ہوئے سے ہیں وہ داستانِ ہجر
ہم داستانِ ہجر سنائے ہوئے سے ہیں

چونکے ہوئے سے ہیں جو سکوں آشنائے عشق
دھوکے سے اُس نگاہ کے کھائے ہوئے سے ہیں

حساس کس قدر ہے محبت کی زندگی
ہم بے خبر ہیں اور اُنھیں پائے ہوئے سے ہیں

وہ سر بسر نہاں، وہ زسر تا قدم حجاب
پھر بھی ہر اک نظر میں سمائے ہوئے سے ہیں

شاید کچھ اس میں شوخی بے گانگی بھی ہے
ربطِ نہاں وہ آج بڑھاتے ہوئے سے ہیں
یوں تو بچے ہوئے سے ہیں گم گشتگانِ عشق
تیری نظر کی چوٹ بھی کھائے ہوئے سے ہیں
ہم بدگمانِ عشق تری بزمِ ناز سے
جا کر کبھی ترے سامنے آئے ہوئے سے ہیں
سنتے ہیں با خبر بھی ہیں تیرے ادا شناس
در پردہ کچھ فریب بھی کھائے ہوئے سے ہیں
کچھ نا شناسِ غم سے ہیں جو آثارِ ہستی
یہ درد بھی انھیں کے اٹھائے ہوئے سے ہیں

یہ قرب و دید بھی ہیں سراسر فریبِ حسن
وہ آکے بھی فراقؔ نہ آئے ہوئے سے ہیں

شاید ترے غم نے کروٹیں لیں
حیرت زدگانِ عشق چونکے

تمام شب ہو کے اٹھا ہوں تری [illegible] ہوں
[illegible] ان سے جو دنیا سنور سکتی ہے [illegible]

۵۴

۱۹۳۶ء

آنکھوں کی گلفشانیاں نہ گئیں
عشق کی شادمانیاں نہ گئیں
اب بھی ہے محوِ داستاں وہ نگاہ
میری جادو بیانیاں نہ گئیں
سرخوشی میں بھی چونک اُٹھتا ہوں
تیرے غم کی نشانیاں نہ گئیں

حیرت افزا سکونِ عشق نہیں
حسن کی بدگمانیاں نہ گئیں

اب تو زعمِ وفا مجھے بھی نہیں
کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں

قصۂ غم حریفِ شامِ ابد
عشق کی بے زبانیاں نہ گئیں

دمِ رخصت بھی بے رخی اتنی
آپ کی مہربانیاں نہ گئیں

جب ستم اب کرم کا رونا ہے
عشق کی نوحہ خوانیاں نہ گئیں

موج نکلی لکیر ساحل کی ہو
بحر کی بیکرانیاں نہ گئیں

خود الجھتا ہوں، خود سلجھتا ہوں
دل کی ریشہ دوانیاں نہ گئیں

بے نیازی میں بھی ہے شانِ رضا
عشق کی حکمرانیاں نہ گئیں

دل سے ڈوبا ہوا سا ضبط میں بھی
اشک غم کی روانیاں نہ گئیں

مضطرب ہجر بھی ہے وصل بھی ہے
حسن کی جانستانیاں نہ گئیں

حشر کا آفتاب تھرّایا
تیری اٹھتی جوانیاں نہ گئیں
اُف یہ محویّتِ نگاہِ فراق
رات دن کی کہانیاں نہ گئیں

سی جب دونوں آتش میں فرق سہل تھا
سے محبت میں آج روتی ہے

۵۵

۱۹۳۹ء

عشق کی دُنیا بھی وہ دنیا نہیں
اب تو تیرا درد بھی اتنا نہیں

انتظارِ نرگسِ مخمور دیکھ
اے محبت تیرے بس میں کیا نہیں

جنبشِ دیوارِ زنداں پر نظر
تیرے دیوانوں کو وہم سودا نہیں

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا
یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے
اب غبارِ راہ بھی اٹھتا نہیں

اور کوئی بات ہے وجہِ سکوت
عشق کو تجھ سے کوئی پردا نہیں

ہے یوں ہی سی دل کو تشویشِ سحر
طولِ شامِ غم سے گھبراتا نہیں

تا بہ امروز ہی امروز ہے
عاشقی میں دوش یا فردا نہیں

خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بیقرار
غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں

موت نے بھی جاننا چاہا مگر
زندگانی کا بھرم کھلتا نہیں

ان جفاؤں پر تری اے حسن دوست
کیوں جفاؤں کا گماں ہوتا نہیں

معنی تقدیر تو وہ تھا کہ خود
کاتب تقدیر بھی سمجھا نہیں

تو نے اپنی بھی تو کچھ پروا نہ کی
لیکن ایسا تو کوئی کرتا نہیں

جوشِ گریہ میں گدازِ عشق دیکھ
قطرے قطرے سے بنا دریا نہیں
تو نے سیّاروں کو سمجھا آفتاب
بے خبر چنگاریاں شعلا نہیں
موت کا اُف وہ پیامِ زندگی
ایک دُنیا نے جسے سمجھا نہیں
درد ہی تو ہے محبت ہی تو ہے
راز ہی تو ہے اگر کھلتا نہیں
زندگی اے دوست غم کا نام ہے
یہ تو شاید شکوہ بے جا نہیں

ماورائے درد و راحت عشق ہے
پر کوئی حساس بھی اتنا نہیں
ہاتھ ملتے ہیں خدا اور اہرمن
تیرا عاشق دین و دنیا کا نہیں
مائل بیداد وہ کب تھا فراقؔ
تو نے اس کو غور سے دیکھا نہیں

آج آغوش میں تھا اور کوئی
ہم تجھے دیر تک نہ بھول سکے

—

۵۶

۱۹۳۸ء

وہ کاوشِ نگاہ کسی پر عیاں نہیں

ہم کیا بتائیں درد کہاں ہے کہاں نہیں

عشق اس طرح مٹا کہ عدم تک نشاں نہیں

آ سامنے کہ میں بھی تو اب درمیاں نہیں

مٹنے کو کوئی قیدِ زمان و مکاں نہیں

مدت ہوئی خلاف مرے آسماں نہیں

مجھ کو بھی اپنے حال کا وہم و گماں نہیں
تم رازداں نہیں تو کوئی رازداں نہیں

صیاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے
اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

اس درگزر سے اور کھلا عشق کا بھرم
یہ کیا ہوا کہ مجھ سے وہ اب سرگراں نہیں

بچھڑے ہوئے اب اور ہی ڈھونڈیں دلیلِ راہ
اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

محوِ سکوتِ نازِ ازل سے ہے گوشِ عشق
قصہ نہیں، فسانہ نہیں، داستاں نہیں

ہیں پرسشِ نہاں کے بھی عنواں اسکو یاد
اتنا تو اسکوتِ نظر بے زباں نہیں

اے دوست اہلِ درد کے رازِ سکوں نہ پوچھ
مدت ہوئی نگاہ تری مہرباں نہیں

کیا حشر دیکھئے ہو اب اس اعتدال کا
سنتے ہیں عشق در پئے آزارِ جاں نہیں

کیا حشر وعدہ کیا رگِ جاں کیا حریمِ راز
یہ جانتا ہوں تو ہے جہاں میں وہاں نہیں

ہمدم دیارِ دل کی جنوں خیزیاں ہیں اور
زنداں نہیں ہے، دشت نہیں گلستاں نہیں

تھا حاصلِ حیات بس اک عشوۂ نہاں
اب یہ نہ پوچھ عشق کہاں ہے کہاں نہیں

سو بزم بے خودی نہ تری چشمِ نیم باز
یہ نشہ، یہ خمار، یہ آگاہیاں نہیں

سچ پوچھیے تو اپنی جگہ ہے نگاہِ دوست
مجبوریاں ہیں عشق کی وہ بدگماں نہیں

تو پھیر لے نگاہِ کرم تو تری خوشی
اس در پہ شادماں تو دلِ شادماں نہیں

اے گردشِ سپہر تجھے ہم بھی دیکھتے
مائل اِدھر وہ نرگسِ آرام جاں نہیں

تو جانِ اضطراب سراپا سکوں بھی تو
اب یہ نہ پوچھ درد کہاں ہے کہاں نہیں

بچھڑے ہوؤں کو دھیان ہزاروں طرح کے ہیں
دل محوِ نالۂ جرسِ کارواں نہیں

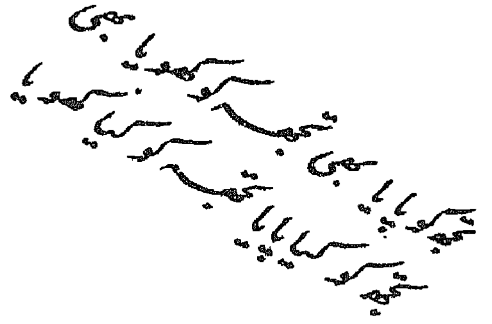
میں بیقرار ہوں تو فضا کیوں اُداس ہے
یہ زندگی ہے موت کی انگڑائیاں نہیں

صد جلوۂ بہار نثارِ شباب دوست
یہ کیف، یہ نشاط، یہ رنگینیاں نہیں

کیا واقعی فریب ہے اے دل حیاتِ عشق
کیوں مژدۂ وصال سے میں شادماں نہیں

ہستی کے انقلاب کو کیا کیجیے فراقؔ
مانا کہ ہجرِ یار غمِ جاوداں نہیں

تم مخاطب ہو سامنے بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں



۵۷

سنہ ۱۹۲۳ء

بھلا رکھا جنھیں تو نے وہ تجھ کو یاد کرتے ہیں
جہنم جھیلتے ہیں جنتیں آباد کرتے ہیں

بتا اے عاشقی تجھ کو قسم شام جوانی کی
کسی کے ہجر میں راتوں کو کیوں فریاد کرتے ہیں

سبق آموز ہیں بربادیاں ان کی بھی اے ہمدم
ہم اُن کے چاہنے والوں کو اکثر یاد کرتے ہیں

کہاں لے جاتی ہیں پل مارنے میں وحشتیں اس کو
جب اچھی آنکھوں والے کوئی دل آباد کرتے ہیں

نہ پوچھو کس طرح کٹتی ہے زنداں میں بہار اپنی
لہو دل کو یہ موسم راستے ابر و باد کرتے ہیں

قیامت ہے قیامت دیکھنا کچھ کو نظر بھر کے
مگر یہ کام ہم اب ہر جگہ بادا باد کرتے ہیں

بتا دے تو نہ میں یاد آنے والے او جفا پرور
تجھے ہم ایسے نازک وقت میں کیوں یاد کرتے ہیں

جگر دل پر نگاہِ ناز تمہیدِ تغافل ہے
کہاں آباد کرتے ہیں کہاں برباد کرتے ہیں

خدا رکھے دلِ سوزاں چراغِ خانہ تھا اکثر
فراقؔ اُس درد کی تصویر کو ہم یاد کرتے ہیں

عشق کیا حسن کا خلوصِ نہاں
حسن کیا عشق کی بس اک چمکار

جو ظالم سچ کی سرگرانی عشق سے بے پروا ہے نہاں
جب کی میراث کی تردید ہی تصدیق بھی ہے

۵۸

۱۹۳۸ء

رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں ؟

کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں ؟

ہاں اُٹھا آنکھیں کہ ہو کچھ پردہ داری عشق کی

اتنی رسوائے جہاں یہ نرگسِ رُسوا نہیں

لے اُڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں

تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش فہمیوں کے بھی فریب
عشق اس کا رونا ہے کچھ تقدیر کا رونا نہیں

دل بھی کہتا ہے ٹھہرنا ہجر میں دشوار ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچھا نہیں

آج حسن و عشق جیسے ہو گئے ہوں مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

ہیں فریبِ احساسِ پنہاں کے سکونِ اضطراب
عشق ہے وہ درد جو گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آسادگی
لیکن ایثارِ محبت جانِ وسعت دنیا نہیں

حسن سرتا پا تمنا عشق سرتا سر غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

سرحدِ جذب و اثر سے حسنِ جاناں دور ہے
عشق کی دنیا بھی شاید عشق کی دنیا نہیں

ہم بھی دیکھیں گے کبھی نازک مزاجی عشق کی
آج جس سے اک ذرا سا نازِ یار اٹھتا نہیں

اے نگاہِ بے محابا تو نے یہ کیا کر دیا
آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں

تذکرۂ کیفیت پر کچھ سمجھ ہم سوز و ساز
عشق میں دل درد ہو جاتا ہے دل دکھتا نہیں

اک اُداسی بھی لئے ہے کیوں نگاہِ نازِ یار
یہ پیامِ زندگی شاید کوئی سنتا نہیں

میں عدم اندر عدم ہوں میں جہاں اندر جہاں
ایک ہی دنیا ہو میری اے فراقؔ ایسا نہیں

تیرا آجانا فکرِ شعر کے وقت
آج تجھ سے بھی نہ بن آئی بات

۵۹

۱۹۳۷ء

شیرازہ دل کا یوں بھی پریشاں کیے چلو
بیباک کے بھی پاسِ محبت کیے چلو

یا وہ کشود اس آنکھ کا لیں یہ پیام ہے
دونوں جہاں کی خیر مناتے چلے چلو

یوں بھی سنا ہے موت کو کہتے ہیں زندگی
جینے کا خیر نام ہے لیکن جیے چلو

شاید یہی حیات کی منزل کا راز ہے
تنہا چلو، جہان کو لیکن لئے چلو

آرام سے ہے کون میر رہگذارِ عشق
دل کو مگر نصیبِ سکوں بھی دئے چلو

یہ بھی ہے ایک رازِ سکوں اضطراب میں
چاکِ جگر کو سوزنِ غم سے سئے چلو

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو
اے اہلِ دل یہ کارِ عبث بھی کئے چلو

کیا بھاگ جاؤں گا میں یہیں لیکے وہ دیا
اے جانے والو ساتھ مجھے بھی لئے چلو

ہر گفتگو ہو اُس سے بجز عرضِ مدّعا
باتوں میں اے فراقؔ لبوں کو سئے چلو

حُسن خود قرب، عشق خود دُوری
یہ وصال و فراق دھوکے ہیں

حسن کر کے خود اپنے ناز سے جب
چھپ کے اپنے سے عشق سے روٹھتے ہیں

۶۰

۱۹۴۶ء

دَورِ افلاک کا شباب ہے تُو　　　آفتابوں کا آفتاب ہے تُو

ٹھہری ٹھہری سی موجِ برقِ جمال　　　چھلکی چھلکی شرابِ ناب ہے تُو

بس کی راتیں طلسمِ خوابِ حیات　　　اُسی وادی کا ماہتاب ہے تُو

نمیں ہے ذکرِ طور و یوسف و خضر　　　انھیں آیات کا جواب ہے تُو

وپ ایسا حسین جیسے گناہ　　　خلق کا حاصلِ ثواب ہے تُو

چھلکتا بھی جائے بھرتا بھی جائے　　　ایسا پیمانۂ شراب ہے تُو

نرم جھنکار سازِ قامت کی — اک کھنکتا ہوا رباب ہے یہ

تو جو صورت پکڑ لے ہے وہ خیال — یکا یک جاگ اٹھے وہ خواب ہے یہ

ہیں جو اجمال نگاہِ شب کبھی — ان فضاؤں میں بار یاب ہے یہ

جو بہاروں کے دل سے اٹھتی ہیں — انھیں شعلوں کا پیچ و تاب ہے یہ

ہیں عبارت جنھی سے رنج و نشاط — ستم و لطف بے حساب ہے یہ

طور ہستاں لچکنے کے انداز — رنگ کا جلوہ سے نقاب ہے یہ

چین انگڑائی سے چلوے ناز — کس کھلے باغ کا گلاب ہے یہ

یہ ستارے ترے پسینے کے — شب کا دہکا ہوا شباب ہے یہ

جس سے ہے گرم چاندنی تیرا — دہکی راتوں کا ماہتاب ہے یہ

کھلی چاندنی میں شعلوں کی کروٹ — موجۂ برق پہ سحاب ہے یہ

سرو چمن زمیں صباحت حسن — سینۂ کہکشاں کا خواب ہے تو

آنت پہ مہکی ہوئی سہانی رات — چہرۂ شب کی آب و تاب ہے تو

اور یہاں سے حسن سے پیدا — اور پیدا ہر انقلاب سے تو

جیسے زیر شفق چراغاں ہو — آنچلوں کا [illegible] ہے تو

کچھ سے جوبن اٹھائی راتوں پہ — ماہتابوں کا ماہتاب ہے تو

رنگ رس اور کھلے شگوفوں کا — مسکراتا ہوا شباب ہے تو

جن پہ چھائی ہیں خزاں کی چھاؤں — ان بہاروں کی آب و تاب ہے تو

آنکھ پڑتی ہے اک زمانے کی — پرتو امکاں میں آفتاب ہے تو

چشم مخمور ہے پیمانے آشنائی — ایسی باتوں کا [illegible] ہے تو

جیسے نغمے فراق سے ہوں — رنج پہلو میں جوئے خواب ہے تو

جس کو کہتے ہیں لوگ خوابِ گراں
ہے وہ خمیازۂ جمال ترا

ہجر کو کے دن ہوئے، کسی کو
بھولتے بھولتے دن لگتے ہیں

کبھی ان آنکھوں کا مد لے کبھی ان ہونٹوں کا رس لے
عشق نے دیکھے ہزار آبِ حیات ہی تو ہے

۶۱

۱۹۳۵ء

قفس میں آ کے رو بیٹھے تھے جب صبحِ گلستاں کو
بہت سمجھا اسیروں نے سکونِ شامِ زنداں کو
بیاباں کر دے ہر ذرّے کو ذرّہ ہر بیاباں کو
نظر کو وسعتیں دے۔ لامکاں کر دا یہ امکاں کو
یہ سامانِ جنوں لے کر چلا ہے کوئی زنداں کو
نگاہوں میں بیاباں کو کلیجے میں گلستاں کو

نہ آیا دوسرا دن قید میں اور جان دے ڈالی

مقدر تھا اسیرو دیکھ لینا شام زنداں کو

بہار چند روزہ کو بہار جاوداں کر دے

فریب رنگ و بو سے کچھ الگ کر لے گلستاں کو

اشارے ہیں جنوں کے تیرے دیوانو لیے زنداں میں

جب ابھریں دل کی چوٹیں یاد کر لینا گلستاں کو

تماشائے چمن، بن چمن، رازِ چمن کیا ہے؟

بہانہ چاہیے کوئی جنونِ فتنہ ساماں کو

امید و یاس کی اے یادِ جاناں حد بھی ہوتی ہے

کوئی آزردہ ہو کر چھوڑ بیٹھا تیرے داماں کو

فریبِ حسن کھانا بھی نہیں ہر اک کی قسمت میں
کوئی کرتا ہے یاد اب تک کسی کے عہد و پیماں کو

در و دیوارِ زنداں دیکھ کر آنکھیں بھر آئی ہیں
کوئی یاد آ گیا ہے تو گرفتارانِ زنداں کو

گلے کا ہار ہے ہستی کا یہ چڑھتا ہوا دریا
تو سمجھا چاک کر دیتے ہیں سلے کر ہر گریباں کو

زمین و آسماں روکیں مکان و لامکاں روکیں
گریبانِ عدم سے وحشیِ دست و گریباں کو

کسی سے کیا تو پوچھے دنیا سے اٹھنا ہاں یہ ہوتا تھا
کن آنکھوں سے کوئی کل دیکھتا تھا شامِ ہجراں کو

نگاہِ یار بزمِ ناز میں دیتی ہے شہ کیا کیا
تقاضہائے پیدا سے نوازشہائے پنہاں کو

فراقِ زار صدقے اس خرام اور ان نگاہوں کے
مٹائے جا جگر دل کو دکھائے جا رگِ جاں کو

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

۶۴

۱۹۳۵ء

یہ فیضِ نیستی کیا کچھ نہیں ملتا ہے انساں کو
اگر توفیق ہو دارِ عدم کر دارِ امکاں کو

جہاں سے لے لیا ہیں نے گریبانِ گلستاں کو
وہیں سے چاک ہوتے دیکھ دامانِ بیاباں کو

محبت سہل ہے تو کیا ہوا پھر سہل ہونے دے
کبھی کچھ مشکلیں بھی مل رہیں گی عشقِ آساں کو

یہی تو پختہ کارانِ محبت پر بھی حیرت ہے
سمجھ کر بھی نہیں سمجھے وہ تیرے عہد و پیماں کو

وہیں سے ہیں بگولے گیں و البتہ مرے وحشت کدۂ دل کی
جہاں سے خوشبوئیں ملتی ہیں دامانِ گلستاں کو

ابھی تو کچھ خلش سی ہو رہی ہے چند کانٹوں سے
انھی تلووں میں اک دن جذب کر لوں گا بیاباں کو

کسی کے چیتھڑوں سے کر لیا پیوند پیراہن
گریبانِ لحد کو دامنِ شہرِ خموشاں کو

عدم کی سرحدوں سے سرحدیں ملتی ہیں ہر جانب
گماں کی وسعتوں سے دیں لپیٹیں بزمِ امکاں کو

مبارک اپنے ہی سر سے اب اپنے سر کو ٹکرانا
بہت شوریدہ سر لڑتے تھے زنداں میں بیاباں کو

ابھی سے ہے نظر انجام پر فرقت نصیبوں کی
کئے بیٹھے ہیں پہلے سے تصور شامِ ہجراں کو

ادائے حسنِ آزردہ کے صدقے کوئی کیا سمجھے
سرشک آلودہ مژگاں کو تبسم ہائے پنہاں کو

عنایت ہے توجہ ہے کرم ہے لطف احساں ہے
مگر کیا کیجئے تیرے تغافل ہائے پنہاں کو

فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے وحشی تو کب کے دے آئے ہوتے گلستاں کو

مری جمعیتِ خاطر فراقؔ اب یونہی ہوتی ہے
پریشاں اور کر لینا خیالاتِ پریشاں کو

۶۳

سنہ ۱۹۳۳ء

فراق نام عدم پر لٹا دو دنیا کو
نہ رنگ لانے دو نیرنگیِ تمنا کو

ہوئے ہیں دیکھ کے حیراں تری تمنا کو
کہ تابِ دید کہاں عاشقانِ شیدا کو

شکستِ رنگ کے آئینہ دار ہی کچھ تھے
چمن کے پردے میں دیکھا جنوں نے صحرا کو

ہزار شکر کے پہلو خلوصِ عشق میں ہیں
سمجھ نہ اور کچھ ان شکوہ ہائے بے جا کو

دلِ حزیں کی بھی بربادیاں نہ پوچھ اے دوست
ملیں وہ نکہتِ گل کو نہ خاکِ صحرا کو

نہ قرب سے اسے مطلب غرض نہ دوری سے
کشش کچھ اور ملی ہے تری تمنا کو

جنھیں بہارِ گلستاں سے بوئے درد آئی
بجا بھی کہنے لگے خندہ ہائے بیجا کو

رہے نہ ہوش سرِ میکدہ ذرا ہشیار
لگے نہ ہاتھ کہیں دیکھ جام و مینا کو

میں ہے نیاز۔ سراپا نیاز بھی میں ہی
ہے ربطِ خاص تجھی سے تری تمنا کو

وہ حسن پردہ نشیں بھی، وہ حسن رسوا بھی
چھپے کلیم سے، پھونکے بھی طورِ سینا کو

نثار پرسشِ غم کے ترے کرم کے نثار
ہیں غیرتیں بھی کچھ ایسے دوستِ عشقِ رسوا کو

بتا کہ دولتِ کونین کیا کرے وہ دل
کہ تجھ سے بھی جو نہ بدلے تری تمنا کو

جو آئے وہ تو قیامت نہیں قیامت تو
وہ ہے کہ ہوئے نہ سے فردِ جو نہ فردا کو

یہ رازِ تشنہ لبی عینِ آبِ حیواں ہے
سمجھ سراب کو دریا، سراب دریا کو
بتائیں کیا در و دیوار کی جنوں خیزی
یہ گھر وہ ہے کہ اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو
کبھی وہ رشکِ جنوں ہوش کو بھی کردیگا
کیا ہے رشکِ خرد جس نے جوشِ سودا کو
نثارِ شانِ تغافل وہ دردِ فرقت دے
جو خود شناس بنا دے تری تمنا کو
جو حسن مائلِ تمکیں ہے مائلِ تسکیں
قرار ہی تو نہیں قلبِ ناشکیبا کو

گدازِ شیشۂ نازک ہے یا دلِ لرزاں
بھرا ہے عشق نے صہبائے تاب فرسا کو

نہ ہے یہ ربط پسند اور نہ احتراز پسند
ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دُنیا کو

وہ عشق کی نگہِ اولیں نہ پوچھ لے دوست
تڑپ ملی وہ کہاں برقِ طورِ سینا کو

خبر کچھ اُن کی بھی رکھتے ہو رنگ و بُو والو
جو کاٹتے چلے جاتے تھے راہِ صحرا کو

فراقؔ نے تجھے دیکھا تھا اُف کن آنکھوں سے
ہے آج تک وہی حیرت تری تمنّا کو

۶۳

سنہ ۱۹۳۶ء

کیفیتِ جمال مدینہ میں عالمِ انتظار دیکھ
بزمِ طرب میں گردشِ نرگسِ پرخمار دیکھ

چشمِ سیاہ کار دیکھ گردشِ روزگار دیکھ
کیفیتِ جمالِ یار میں دردِ فراقِ یار دیکھ

تابِ نظر کی فکر کیا ذوقِ نظر کا ذکر کیا
جلوۂ بیقرار دیکھ تابشِ باربار دیکھ

ابرِ حجابِ ناز میں کوند رہی ہیں بجلیاں
تیرے سکونِ دل کی خیر عشوۂ شرمسار دیکھ

لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پہ
عالمِ عشق ہے گماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ

نیند سی آ چلی ہے کچھ ہر دلِ بے قرار کو
دیکھ یہ رنگِ بیخودی گیسوئے تابدار دیکھ

جس کا پیام زیرِ لب باعثِ خلقتِ جہاں
اُس کی نظر کی زد پہ آج عالمِ اعتبار دیکھ

تاہم بہار سے خزاں لوٹی نہ تھی کے چمن
آج خزاں کے بھیس میں آئی ہوئی بہار دیکھ

عشق کی پہلی زندگی عشق کے پہلے سوز و درد
بھول۔ مگر ندامتِ حسنِ وفا شعار دیکھ

آگے قدم بڑھائے جا اور نگاہِ شوق بھی
دیکھ سوادِ شہرِ دوست اٹھتا ہوا غبار دیکھ

برقِ نوا سے راز ہے سینۂ رنگ بستۂ گل
حسنِ جمالِ یار میں سوزِ فراقِ یار دیکھ

دُور وہ جلوہ گاہ ہے عالمِ وصل و ہجر سے
یادِ جمالِ دل فروز یا غمِ روزگار دیکھ

رازِ غمِ فراق کا اس سے کھلے گا کیا مگر
دیکھ نہ کر سکے بیخودی دیدۂ بیقرار دیکھ

۶۵

۱۹۴۲ء

بزم میں آج ان آنکھوں کا عالمِ بیخودی تو دیکھ
رنگِ فسوں گری تو دیکھ جادوئے سامری تو دیکھ

بادِ بہار بے قرار روحِ بہار وجد میں
گیسوؤں کی لپٹ تو دیکھ مہکی ہوئی ہنسی تو دیکھ

جیسے چھلک چھلک پڑے جام سے بادۂ حیات
اُف یہ زمیں کی کروٹیں شانِ خرام کی تو دیکھ

لے کے دلِ نجوم کو ڈوبی ہے نبضِ کائنات
عالمِ صبحِ زندگی رات اگر کٹی تو دیکھ

آنکھ چُرائیں جس طرح تارے اندھیری رات میں
غم کی زیادتی تو دیکھ، آنسوؤں کی کمی تو دیکھ

دن سے تھے نکلتے بیٹھتے دُور تھی منزلِ خزاں
کلیوں کی سانس اُکھڑ گئی مانگے کی زندگی تو دیکھ

مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے رُوحِ انقلاب
شورشِ گیر و دار سے نیند اُچٹ گئی تو دیکھ

گام بہ گام مہر و ماہ، چاروں طرف شبِ سیاہ
دل کا کنول بجھا دے جو یہ نئی روشنی تو دیکھ

پلٹی ادھر نگاہِ ناز، دل سے ادھر دھواں اُٹھا
دولتِ دید لٹ گئی پھر بھی رہی سہی تو دیکھ

صحبتِ شب کی داستاں ہمیں سمٹ کے آ گئی

پچھلے پہر کو بزم میں شمع کی تھرتھری تو دیکھ

سیلِ سکوں نما ہے یا طرزِ خرامِ انقلاب

چڑھتی ہوئی ندی کا آج عالمِ کم روی تو دیکھ

بنتی ہے کیسے کائنات بے خودیِ نشاط سے

دردِ حیات کی طرح اُس کی نگاہ اُٹھی تو دیکھ

بحثِ غم و نشاط میں بیت گئی شبِ حیات

جاگنے والے سو گئے حاصلِ زندگی تو دیکھ

ہونٹوں پہ کھیلتی ہنسی، نرگسِ ناز شرمگیں

شکوۂ جور سب بجا اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ

جیسے نشاط مسکرائے جیسے صباح تھرتھرائے
جیسے حیات رسمسائے حسن کی تازگی تو دیکھ

جیسے پیام راز آئیں شعلۂ ساز تھرتھرائیں
جیسے ستارے مل کے گائیں حسن کی نغمگی تو دیکھ

جیسے سکون تھرتھرائے جیسے سکوت کچھ سنائے
جیسے شگفتہ مسکرائے حسن کی طرفگی تو دیکھ

دل تو جمال دلفریب شام نہیں سحر نہیں
زلف کی ابتری تو دیکھ رخ کی شگفتگی تو دیکھ

روح نوائے سرمدی آج ہے گوش بر صدا
بزم سکوت شام میں حسن کی نغمگی تو دیکھ

آنکھوں سے رہ کے اوجھل آج کون یہ مسکرا دیا
غم کی فضائے تیرہ میں برق کی موج سی تو دیکھ

صاف افق مہک اٹھا کھل اٹھا لہلہا اٹھا
جیسے کھلا ہوا کنول صبح کی تازگی تو دیکھ

مست کہوں کہ ہوشیار سروِ روانِ حسن کو
چال کی لغزشیں تو دیکھ آنکھوں کی آگہی تو دیکھ

جلوۂ رنگ رنگ میں بس تجھے دیکھتا رہا
رنگِ مزاجِ حسنِ یار عشق کی سادگی تو دیکھ

نیکی بدی کی فطرتیں دہر کی سب حقیقتیں
نامِ خدا بدل گئیں حسن کی کافری تو دیکھ

مجھ سے نگاہِ آشنا پرسشِ حال کر سکے؟

ہونے پہ سامنا کبھی، آنکھ بھی مل گئی تو دیکھ

قسمتِ عشق کو سراہ، روکے ہوئے سرشکِ غم

پھر یہ کہاں جمال و دید، بعد کو رہ، ابھی تو دیکھ

جیسے سکوت و گفتگو مل کے سنائیں داستاں

نرگسِ نیم وا میں ہے بات یہی، یہی تو دیکھ

یوں تو کہاں جمالِ یار اور کہاں یہ حالِ زار

کہنے کی بات ہے فراقؔ اپنی طرف کبھی تو دیکھ

اپنے گھر کا ہر اک راجا

عشق کا گھر پردیس ہے لیکن

شعورِ عشق کی تکمیل ہو چکی شاید

نہ بھولتا ہے کوئی اب نہ یاد آتا ہے

جو اضطراب سے شاید وہی شکیب بھی ہے

سبھی تجھے سو یاد آتے ہے

ہزار یہ ورد

۶۶

سنہ ۱۹۳۵ء

ہم جاگ رہے تھے سینے میں رہ رہ کے کھٹک سی ہوتی تھی
گہرا سناٹا چار طرف چھایا تھا دنیا سوتی تھی
باتوں میں کبھی جو کٹ جاتی تھی اب آنکھوں میں کٹتی ہے
یہ رات پہاڑ سی اک دن تھا جب کتنی چھوٹی ہوتی تھی
بے باک نظر کے ٹھوکر سے آنکھیں ملتی ہوئی جاگ اٹھی
او غافل اس ویرانے میں اک درد کی دنیا سوتی تھی

رہتی دنیا کی آوازیں آ آ کے جہاں سر پیٹ گئیں

وہ گور غریباں کی بستی کن گہری نیندوں سوتی تھی

کٹ جاتی ہے اب بھی کٹنے کو لیکن اک وہ بھی زمانہ تھا

جب رات رات سی ہوتی تھی جب صبح صبح سی ہوتی تھی

سوتے سے کسی کا اٹھنا بھی اک عالم ہوتا تھا ہمدم

بکھرے ہوئے تھے بال آنکھ بھی نیند کی ماتی ہوتی تھی

وہ ڈوب ڈوب کے ابھر آنا وہ درد کی طرح چپ ہو جانا

اے قاتل کسی معصوم کے خوں میں تیز چھری سی ڈوبی تھی

وہ رات فراق سے یاد ہے اب تک وہ صبح نہیں بھولی

جو کاٹے سے کٹتی نہ تھی جو ہوتے ہوتے ہوتی تھی

ستمبر

۱۹۳۴ء

سینۂ شوقِ زار کا دیکھو گے تم جو چیر کے
ٹکڑے ملیں گے جا بجا زہر میں ڈوبے تیر کے

حلقۂ چشم کی ترے یاد ہے بے خودی میں بھی
ساغروں کے خط بنے عکس اِسی لکیر کے

یاد جو کوئی آ گیا آنکھ بھر آئی دل دکھا
پوچھ اثر نہ ہجر کے صدمۂ ناگزیر کے

آپ کے جاں نثاروں میں کن کے بڑے ہیں مرتبے
کچھ ہیں شہید تیغ کے کچھ ہیں شہید تیر کے

لذت زیست چاہیے تو درد میں ڈوب جائیے وہ
ہیں یہ اشارہ نہاں اُس کے کھٹکتے تیر کے

آنکھ کھلی تو ساقیا بزم طرب میں صبح تھی
پچھلے کو آ گئی تھی نیند جب چلے دور اخیر کے

گو ہوں غریق بحر غم ابھروں گا اے فلک کبھی
ہاتھ تو بڑھنے دے ادھر تو مرے دستگیر کے

شدت درد سے مجھے حشر میں نیند آ گئی
صدقے ہزار اضطراب تیرے کھٹکتے تیر کے

حسن کہیں چلا ہے آج خاک بسر برہنہ پا
فتنۂ حشر اُٹھ ذرا، لے لے قدم فقیر کے

پچھلے پہر کو ساقیا قول ترا یہ دے کے جام
گردشِ چرخ کیا دکھا گئے دور یہ ہیں اخیر کے

ہم بھی رہے ہیں بیقرار، ہم میں بھی اضطراب تھے
ہستیٔ پُرخلش کے کچھ کچھ تری نوکِ تیر کے

درد رہا نہ اب فراقؔ درد کی وہ چمک رہی
سینے میں کچھ کرشمے تھے اُن کے کھٹکتے تیر کے

۶۸

۱۹۳۵ء

کچھ نہ کچھ عشق کی تاثیر کا اقرار تو ہے
اس کو الزامِ تغافل پہ کچھ انکار تو ہے
ہر فریبِ غمِ دنیا سے خبردار تو ہے
تیرا دیوانہ کسی کام میں ہشیار تو ہے
حسن رسوا سہی ہر کوچہ و بازار تو ہے
کوئی عالم نہ ہو یہ عالمِ اسرار تو ہے

آج تک بھید کسی کو نہ ملا تھا نہ ملی
یہ تری نرگسِ مخمور خبردار تو ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے مشتاقِ جمال
جشنِ دیدار نہ ہو حسرتِ دیدار تو ہے

معرکے سر کر اسی قلبِ تپاں سے اے دل!
یہ چمکتی ہوئی چلتی ہوئی تلوار تو ہے

نہ سہی دولتِ دنیا ترے جانبازوں کی
ملکیت ہیچ ازل سے رسن و دار تو ہے

سیرِ ظلمت کدۂ دہرِ جفاکال کے لئے
گردشِ جام تو ہے محفلِ سرشار تو ہے

سر ٹپکنے کو پٹکتا ہے مگر رک رک کر
تیرے وحشی کو خیالِ در و دیوار تو ہے

دل کا بھی ٹھیک نہیں موت کا بھی ٹھیک نہیں
اب جئے وہ کہ مرے زیست سے بیزار تو ہے

کیوں ترے ناوکِ بیداد نے منہ موڑ لیا
لاکھ بیدل ہو مگر عشق جگر دار تو ہے

عشق کا شکوہ بجا بھی نہ بیکار گیا
نہ سہی جور مگر جور کا اقرار تو ہے

تجھ سے ہمت تو پڑی عشق کو کچھ کہنے کی
خیر شکوہ نہ سہی شکر کا اظہار تو ہے

اس میں بھی رابطۂ خاص کی ملتی ہے جھلک
خیر اقرارِ محبت نہ ہو انکار تو ہے

ہم سے چھپنا ہی مناسب تھا اے برقِ جمال
پھونک دینے پہ تلی آہ شرر بار تو ہے

سحر و شام سرِ انجمنِ ناز نہ ہوا
جلوۂ حسن تو ہے عشق سیہ کار تو ہے

کئی عنوان ہیں ممنونِ کرم کرنے کے
عشق میں کچھ نہ سہی زندگی بیکار تو ہے

کیوں جھپک جاتی ہے رہ رہ کے تری برقِ نگاہ
یہ جھپک کس لئے اک کشتۂ دیدار تو ہے

کیف ساما نی عالم کو اُن آنکھوں سے نثار

دلِ مدہوش تو ہے ساغرِ سرشار تو ہے

چونک اُٹھتے ہیں فراقؔ آتے ہی اس شوخ کا نام

کچھ سراسیمگیٔ عشق کا اقرار تو ہے

قطعہ

زندگی درد زندگی درماں

اس میں انکار کا کہاں امکاں

زندگی کو غم و نشاط سے کیا!

زندگی زندگی ہے او ناداں!

۴۹

۱۹۲۶ء

پیرہن ہی میں تیرے وحشتوں کا ساماں ہے
پھاڑیئے گریباں ہے دیکھئے گلستاں ہے

چاک چاک دامن ہے دھجیاں گریباں ہے
تار تار میں لیکن اک جہاں پنہاں ہے

باعثِ گراں خوابی سوز و سازِ ہجراں ہے
کیفِ خوابِ ہستی بھی کیفِ خوابِ زنداں ہے

وصل میں جو شاداں ہے ہجر میں جو گریاں ہے
وہ فراق کیا جانے کیا جمالِ جاناں ہے
عندلیب کی تقدیر کیسی نیند سوئی ہے
غنچۂ چمن پیچ ہے خوابِ گُل پریشاں ہے
محوِ انتظار آنکھیں ہیں مری۔ مگر کس کی؟
جو نہ صاف ظاہر ہے جو نہ صاف پنہاں ہے
ہاں نہ جو نظر آئے سینے میں جو در آئے
دل میں جو اُتر آئے نشترِ رگِ جاں ہے
خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے
اک شگون سے پا پا ہستیِ پریشاں ہے

موجِ بحر ہے ساحلِ بحر ہی تو ہے غافل
ایک محیطِ لامحدود قیدِ حدِّ امکاں سے ہے

ایک رازِ ہستی سے ہے فرق ہے تو بس اتنا
حسن میں وہ پنہاں ہے عشق میں نمایاں ہے

درد ہی تو ہے دل کا چوٹ ہی تو ہے دل کی
اُٹھ پڑے قیامت ہے بیٹھ جائے پیکاں ہے

اُس کا ملتفت ہونا، اُس کا مہرباں ہونا
چاہیئے تو مشکل ہے سوچیئے تو آساں ہے

سازِ ہے جنوں کا دل، داغ ہے جنوں کا دل
دل اُٹھے تو بلبل ہے کھل اُٹھے گلستاں ہے

اور کیا کہوں اے دل تیری خیر سے گذرے
مہرباں اے ناداں ایسے دشمن جاں سے
عمر کی روانی کیا؟ ایک بوند پانی کیا؟
موج خستہ ہستی اک خروش پنہاں ہے
قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں سب عالم
رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے
اے فراق انھیں پاکر ہم یہ دل میں کہتے ہیں
سوچئے تو مشکل ہے دیکھئے تو آساں ہے

۲۰

سنہ ۱۹۴۶ء

نکلا تو ہوں بچا کے میں برق نظر تری
مجھ کو نہ خاک کر دے کہیں رہگذر تری

آخر فراق بن نہ گئی جان پہ تری
کمبخت پڑ گئی نہ کسی پہ نظر تری

موج ہوا کے ہاتھ میں ہے دامن بہار
سر پیٹتا ہے کوئی گھڑا راہ پر تری

کیا پردہ داریاں ہیں تری اے نگاہِ مست
تہہ پا سکا کوئی بھی نہ اے بے خبر تری

دل خون ہو کے سینے میں سو بار رہ گیا
رنگینیاں دکھا گئی کیا کیا نظر تری

کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی
اٹھتی چلی ہے سوئے گلستاں نظر تری

اک وقت ہوگا ہم سے جو دیکھا نہ جائے گا
ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری

ناکام جا رہے ہیں تری بزمِ ناز سے
ہم تیرہ بخت آئے تھے امید پہ تری

اے وعدہ کرکے بھولنے والے ترے نثار
جینا پڑے گا کتنے دنوں بات پر تری

مجھ کو جلانے کے لئے اللہ رے اہتمام
اک برق زار بن کے اٹھی ہے نظر تری

کیفیتوں میں ڈوبی ہوئی اے نگاہ مست
کیا ہر کہیں ہیں تیرے دیکھنے والے خبر تری

پر سوز بساز اے غم ہستی ترے نثار
تصویر بن کے رہ گئی شمع سحر تری

صبح شب فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگذر تری

۱۷

سنہ ۱۹۴۴ء

وہ روٹھنا ترا آج آرہا ہے یاد مجھے
کہا تھا میں نے نہیں تیرا اعتماد مجھے
پکڑ لیا سر محشر کسی نے ہاتھ مرا
بس آج مل گئی اپنی وفا کی داد مجھے
یہ انقلاب ولولوں کا کبھی کم ہوا ہوگا
نہیں ہوں یاد تمھیں اب نہ تم ہو یاد مجھے

تمہیں کہ غیر ستا سکے تو میرے ہو جاؤ
یہی بہت ہے کہ اس وقت کر لیا یاد مجھے

ترے فراق میں اے یار شام کی دنیا
دلا رہی ہے کسی غمکدے کی یاد مجھے

وہی بتائیں کہ رسوائیاں پڑھیں کیسے
جو سب میں کہتے پھرے باعثِ فساد مجھے

وہ آنکھ پھر گئی تیری ایسی ہی کبھی گردش
مگر ہیں پہلی نگاہیں کسی کی یاد مجھے

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی نے
تھکی تھکی سی وہ عرضِ وفا ہے یاد مجھے

[illegible]

سلام شوق کہا ہے فراق نے تجھ کو
ملا تھا مدتوں پہ کل وہ نامراد مجھے

آداسی بھی ہے محبت کا فسانہ جیسے پڑھا اس کے چہرہ
دیکھیے تو داستاں سے دل اس کی سے بتا جاتا ہے

۴۷

۱۹۳۵ء

اب نہ داماں ہے کوئی نہ گریباں کوئی
منزلوں چھوڑ گیا باغ و بیاباں کوئی
جس طرح تار میں نغمہ ہے نہاں پھول میں بو
میری رگ رگ میں اسی طرح ہے پنہاں کوئی
کچھ تجاہل بھی مرے ذکر پہ کچھ شرم بھی ہے
کیا ہوں میں کبھی تم اتنا ہوا پشیماں کوئی

یہ بھی سچ ہے کہ ہم آوارہ و سرگرداں تھے
یہ بھی سچ ہے کہ ہمارا نہیں پرساں کوئی

نقش اب حسن کی تصویر ہوا جاتا ہے
اور چھپا ہے تو رہے آج بھی پنہاں کوئی

داغ دل یاد بہاری سے کھلے آتے ہیں
آہ چھپتا ہی نہیں راز گلستاں کوئی

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

کہیں اٹھتے ہیں کہیں پڑتے ہیں پائے تمکیں
مجھ تک آتا ہے بہ اندازِ گریزاں کوئی

نہ جوانی ہے نہ دل - رات گئی بات گئی
اب شبستاں ہے نہ ہے شمعِ شبستاں کوئی

دلِ گم گشتہ کی آتی ہے مجھے یاد فراق
جب نکلتا ہے بچائے ہوئے داماں کوئی

۴۳

۱۹۳۶ء

اب ختم ہو عتاب کہیں رحم آ چکے
گو تارِ عشق خون میں اپنے نہا چکے
مدت ہوئی کہ یاد کسی کی بھلا چکے
خوش حال اضطراب ہجر کے صدمے اٹھا چکے
کب سے لذیذ رہی ہے خفتا کا شناسا کی
اے شوخ شرمسار تجھے شرم آ چکے

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکونِ عشق
وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے

گزرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون
سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

اب حسن کی گلی میں کہاں ہیں فتنہ گریاں
مدت ہوئی کہ ہوش میں دیوانے آ چکے

پہنچا اور بلند اسد ہستی کو کر دیا
ان آنسوؤں نے پائی ہیں لالے سے تیرے زخم بنا چکے

اے دل یہ کہاں کی بات نکالی کہ اب نہیں
اگلے دنوں کے لطف و کرم یاد آ چکے

اُن کا بھی کیفِ تمکنتِ حسن بڑھ گیا
اپنے بھی نالے عرش کے پائے ہلا چکے

جلدی ہی بھی ہے پیام پہنچنے کی دیر ہے
پیغامبر پیام کو لے کر صبا چکے

دل پہ کبھی فریبِ سکوں کے بھرم کھلیں
یوں ہی قضیۂ ستمِ صبر آزما چکے

اب اور رنگِ عالمِ امکاں نظر میں ہے
آنکھوں میں اس دیار کے جلوے سما چکے

پھر شوقِ وصل و حوصلۂ دید پوچھنا
کچھ راہ پہ مزاجِ ستمگر بھی آ چکے

بیتاب دید آج کبھی بیتاب دید ہیں
وہ کس طرح جمال خود آرا دکھا چکے

اے دل حیات عشق کا پانا محال ہے
ہم جان تک تو اپنی اسی میں گنوا چکے

تقدیر میں ہر ایک کی یہ برق ادا کہاں
کچھ یہ وہ اے فراق میں مسکرا چکے

۳

۱۹۳۶ء

ہم کو یہ ڈر کہ وقت نہ رخصت کا آ چکے
مدت ہوئی وہ ہاتھوں سے دامن چھڑا چکے
پچھلے دنوں کے لطف و کرم یاد آ چکے
آنکھوں میں آج اشک سے [illegible] چکے
ہم سوچتے ہیں یاد کسی کی بھلا چکے
دل پہ جو کچھ گزر [illegible] چکے

اِن گردشوں میں کاوشِ صبر و سکوں ہے اب
آوارگانِ دشتِ جنوں خاک اُڑا چکے

ممنونِ انقلابِ غمِ روزگار ہوں!
صبر و قرار، ہوش و خرد جا کے آ چکے

اب تک جہانِ گورِ غریباں خراب ہے
آسودگانِ خاک کو اب نیند آ چکے

آوارگانِ غم کو ٹھکانا ملے کہیں
دامانِ دشت کو بھی گریباں بنا چکے

ٹھہرے ہوئے دل آج بھی کچھ منتظر سے ہیں
تیرِ نگاہِ ناز نشانے اُڑا چکے

اک شوخیِ نہاں بھی سکوتِ نظر میں ہے

ہم ماجرائے دردِ محبت سنا چکے

اب عشق ہی رُلائے تو کچھ رو سکیں کہ وہ

ہم بیکسانِ رنج و الم کو رُلا چکے

تجھ کو بھی کچھ ہے معرکہ آرائیوں کا ہوش

لب تشنگانِ برقِ نظر سامنے آ چکے

اے حسنِ بے نیاز یہ حالت بھی تا کجے

دشمن کو دوست، دوست کو دشمن بنا چکے

سمجھے ہوئے تھے ہم سفرِ زندگی جنھیں

وہ کاروانِ درد بھی منزل پہ جا چکے

اس شوخیٔ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق

کھوئے نہ ہم گئے تھے ابھی اور وہ پا چکے

رہ رہ گئے اشک آگ لگاتے تھے جو فراق

وہ قطرہ ہائے اشک بھی دریا بہا چکے

ہم اہل دید و دل جو سے آ سکے بھٹک گئے

تمہاری راہ میں جب آل نہیں رہا

۷۵

سنہ ۱۹۴۳ء

لپٹی ہوئی قدموں سے ہو وہ راہگذر بھی
ایک ایک قدم جس میں ہے منزل بھی سفر بھی

افسانہ در افسانہ ہے گویا وہ نظر بھی
کچھ کہنے کو ہے جیسے لبِ دیوار و در بھی

ہر سانس میں آتی ہے عجب دل کی خبر بھی
کچھ ساکن و ساکت بھی ہے کچھ زیر و زبر بھی

بیگانہ تھا کچھ حسن بھی کچھ میری نظر بھی
اک آگ لگی کل سے اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

بچ بچ کے تو صد چاک کیا دل بھی جگر بھی
تیری نگہہ ناز کہیں جائے اُتر بھی

اے نرگسِ مخمور ابھی دنیا نہیں بدلی
اک گردشِ مستانہ باندازِ دگر بھی

بربادیِ دل کی تو امیدیں نہ تھیں لیکن
کچھ گردش اِن آنکھوں کی بھی کچھ دورِ قمر بھی

اُچٹے ہوئے دل پھر بھی ہیں اٹکے ہوئے کیا کیا
دنیا ہے عجب جا کہ پردیس بھی گھر بھی

اس درجہ نہیں بیکسیِ شامِ غم اپنی
اُٹھ جاتے ہیں تاروں کے اِدھر دیدۂ تر بھی

اے دوست یہ عالم ہے خرابات کا عالم
رکھتی نہیں یہ آنکھ تری اتنی خبر بھی

ہلکی نہیں اس درجہ قبا زہد کی زاہد
ناکردہ گناہوں کے ہیں کچھ دامنِ تر بھی

کچھ بوئے کفن آتی ہے پچھلے کی ہوا سے
پنہاں ہے شبِ تار میں پیغامِ سحر بھی

گذرا ہے فراقِ وطن آوارہ اِدھر سے
کچھ چاکِ گریباں بھی تھا کچھ خاک بسر بھی

۷۶

سنہ ۱۹۳۲ء

ہستی کو بنا دینا اسے عشق کی بے اثری
اک دوزخ بے تابی اک جنت بے خبری

گھٹتی نہیں ہشیاری بڑھتی نہیں بے خبری
قسمت کی بھی کوتاہی ساقی کی بھی کم نظری

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

[illegible]

ڈرسا ہوا آئینہ، چٹکا ہوا پیمانہ!
ٹوٹے ہوئے دل کی بھی یہ حیرت و بےخبری
کچھ ترک و غنا لے لے، کچھ فقر و فنا لے لے
ہاں راہِ محبت میں سامان ہوں سب سفری
ممکن ہو تو سوچے جا، ممکن ہو تو دیکھے جا
ہوتے ہوئے آنکھوں کے ا ان کی بے بصری
گھٹتی ہی چلی جائے امیدِ شکیبِ دل
بڑھتی ہی چلی جائے اُن آنکھوں کی بےخبری
بیداد ستمگر نے ہستی ہی بدل ڈالی
اس پر بھی نہیں چونکے اللہ ری بےخبری

اب یاد نہیں یہ بھی کیا دردِ محبت تھا
کچھ بیدلی اپنی بھی کچھ دل کی بھی بے جگری

"یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ"
افسانہ بھی وہ جس کی کچھ پوچھ نہ بے اثری

ساغر ہو کہ نرگس ہو ذرے ہوں کہ تارے ہوں
ہر آنکھ میں دیکھا ہے اک عالمِ بے خبری

ارمان بھرے دل کا اب ذکر نہ کر ہمدم
وہ فصلِ چمن آئی، وہ فصلِ چمن گزری

تہ جن کی نہیں ملتی دل ہے انہیں آنکھوں کا
گم کردۂ ہشیاری وارفتۂ بے خبری

یہ کیسی کشاکش میں ہے عشق کی غیرت بھی
شرمندۂ ہشیاری، منت کش بے خبری

یا کچھ بھی نہ بھولا تھا یا یاد نہیں کچھ بھی
ہشیاری تو ہشیاری، بے خبری تو بے خبری

اب ذکر نہیں دل کا دیکھا نہ فراق آخر
اُن آنکھوں کی ہشیاری اُن آنکھوں کی بے خبری

۷۷

سنہ ۱۹۱۹ء

مجھ سے اگر جدا بھی ہوئے تم تو کیا ہوئے
رونا تو ہے اسی کا کہ لڑ کر جدا ہوئے

تکلیف پردہ داری الفت نہ اٹھ سکی
شاکی کسی کے جور کے ہم برملا ہوئے

سوئے ہوئے نصیب نہ جاگے ہمارے حیف
ہنگامے تیری چال سے لاکھوں بپا ہوئے

کیوں تیری جلوہ گہہ میں نوا ہائے دل ہیں بند
یہ ساز بزم ناز میں کیوں بے صدا ہوئے

پاتے جو ہم تجھے تو خدا جانے ہوتے کیا

کھو کر تو ہم تجھے دل سے بے مدّعا ہوئے

مجبوریاں کسی کی نہیں یہ دلیتیں ہمیں

چرچے ہمارے عشق کے جب جا بجا ہوئے

جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائے تھے ہم تجھے

تجھ پر نثار دل سے مگر بارہا ہوئے

مست ازل جو بادۂ گلگوں نہ پی سکے

وہ اچھی آنکھوں والوں کی شاید حیا ہوئے

چینِ خفی وہ ابروؤں پہ تیرے ہائے ہائے

آزردہ تیری بزم میں جب ہم ذرا ہوئے

ٹوٹا دل اس طرح کہ خدا یاد آگیا
اس آئینے کے ٹکڑے سبھی حق نما ہوئے

دل کا اب اور ساتھ وہاں دے نہیں سکے
ہم آج اس غریب سے رو کر جدا ہوئے

اب بار زیست کا بھی اُٹھانا ہوا محال
ہم جسم عشق کر کے کسی کی ادا ہوئے

باقی نہیں ہے اب ہمیں رقِ نگاہِ یار
اُف دیکھتے ہی دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوئے

گو عشق کو نہ سمجھے تھے ہم ہجر میں فراق
یہ تو ہوا کہ حسن کے راز آشنا ہوئے

۸ سے

۱۹۳۶ء

وابستہ ہیں تجھی سے سب ارمانِ دوستی
تو جانِ دوستی ہے تو ایمانِ دوستی

اس احتیاطِ حُسن کا اے دل بُرا نہ مان
یہ کم نگاہیاں ہیں نگہبانِ دوستی

کچھ عشق بے قرار بھی شرمندہ ہو چلا
اُٹھنے چلی وہ نرگسِ حیرانِ دوستی

کن مشکلوں میں شکوہ بیجا ہے عشق کا
پیدا اسے جو حُسن سے بھی شانِ دوستی

ہم باغِ خلد کو بھی نہ لائیں خیال میں
ہاتھ آئے گر ترا سرِ دامانِ دوستی

اُٹھتی ہے پھر نگاہِ کرم مدّتوں کے بعد
لے کر جلو میں صد سر و سامانِ دوستی

ہر سو چمن چمن تری اے نو بہارِ ناز
پھیلی ہوئی ہے بوئے پریشانِ دوستی

یادِ نگاہِ یار پھر آئی لئے ہوئے
سامانِ صد جراحتِ پیکانِ دوستی

اس شوخیٔ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
بدلے ہی جا رہا ہے وہ عنوانِ دوستی

کھلتا نہیں ہے صاف پیامِ نگاہِ لطف
اک تیرِ نیم کش ہے یہ پیمانِ دوستی

مصروفیت تغافلِ آہوئے ناز کی!
فرصت نہ دشمنی کی نہ امکانِ دوستی

اتنا بھی رشکِ تہمتِ اغیار کیا کریں
یہ بھی ہیں کوئی دن ترے مہمانِ دوستی

اب اور کیا کہیں کہ ہم اہلِ رضا سے بھی
آخر نہ اُٹھ سکے ترے احسانِ دوستی

اس چشمِ نیم باز میں پنہاں ہیں اے فراقؔ
صد ہا فریبِ مشکل و آسانِ دوستی

۷۹

۱۹۳۷ء

وفورِ شوق کو شوخیِ حسن راہ تو دے
یہ برقِ جلوہ تری فرصت نگاہ تو دے

رہے گا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیِ نگاہ تو دے

دل اپنا ڈوب چلا جب تو ذکرِ ساحل کیا
یہ ناؤ بیٹھ کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

غم و خوشی میں ترے حسنِ بے پناہ کی خیر
تباہ حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

علاجِ خوبیٔ تقدیرِ عشق کیا ہمدم
وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ تو دے

بتائے کون خموشی کو داستاں کرنا
کہ یہ پیامِ نہاں دے تری نگاہ تو دے

اک آہ سرد سہی اک نوائے درد سہی
یہ ضبطِ غم کبھی بیچارگی کو راہ تو دے

ہر اک کے ہوش کا کھل جائے گا بھرم ساقی
کچھ اذنِ بادہ کشی مستیٔ نگاہ تو دے

بجا بجا یہ ہر انداز کیف و مستی کا
خبر کچھ اپنی مگر نرگس سیاہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غم جاناں
کشاکش غم دنیا سے کچھ پناہ تو دے

رہی ہے راز سراسر اگرچہ فطرت حسن
ہوا کسی کو مگر دامن نگاہ تو دے

تمام عمر اسی انتظار میں گزری
کہ تاب حسن کو بے تابیٔ عشق راہ تو دے

ظہور حسن سہی عالم شہود سہی
پتہ مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

کسی کی رنجشِ بے جا سے دل کبھی نادم ہے
کچھ آج اپنی صفائی یہ بے گناہ تو دے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنالیں گے
پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ تو دے

سروں سے کھیلتی موجِ فنا گزر جائے
اُترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

نہ بے قرار رہے گا نہ باقرار کوئی
پیامِ ہوش ربا گردشِ نگاہ تو دے

ذرا دو راہۂ ہجر و وصال سے بچ کر
فراقؔ دل میں کبھی اپنے دل کو راہ تو دے

۸۰

۱۹۳۴ء

کچھ اور اب اپنی زندگی ہے
یہ دوستی ہے یہ دشمنی ہے!
آئی ہوئی نیند زندگی ہے
پندار خودی کبھی بیخودی ہے
اے دوست یہ کوئی زندگی ہے
جو تجھ سے بچھڑ کے کٹ رہی ہے
کیا کہئے کہاں ہے اپنی منزل
تلوؤں میں ہے جذبِ دُوربینی ہے

خاموش ہوں پرستش نہاں پہ
تفصیل بھی اختصار بھی ہے

بس شکوۂ دوست ہے تو اتنا
نیکی میرے لئے بدی ہے

پنہاں ہے جو حسن جانستاں میں
دکھتی ہوئی چوٹ عشق کی ہے

ہر سانس ہے مرگِ ناگہانی
اب اپنی حیات زندگی ہے

دریا بھی ہوں میں سراب بھی ہوں
ساقی یہ کمالِ تشنگی ہے

یہ ہستیِ تنگ دہر اے دوست
سرمایۂ نازِ دہر بھی ہے
ہے حسن صدا بہار اے دل
تو عشق سدا سہاگ بھی ہے
دے جی کے ثبوتِ مرگ ناداں
مرنے کی ہوس کم آگہی ہے
اے دردِ فراق اے غمِ یار
بیتاب بھی ہوں میں صبر بھی ہے
وحشت پہ فراق کی نہ جانا
اک یہ بھی ادائے بیخودی ہے

۸۱

۱۹۴۸ء

جیتے جی عشق کی دنیا میں مرجانے کی صورت کبھی دیکھی

اس دل کے ارادے کبھی دیکھے اُن آنکھوں کی نیت کبھی دیکھی

جب قید سے چھٹتے کبھی نہ بنے وہ قیدِ محبت کبھی دیکھی

جینے کی مصیبت کبھی دیکھی مرنے کی ندامت کبھی دیکھی

دیکھا ہی نہیں کام اپنا تمام اک برقِ نظر میں ہو جاتا

ہم خاک نشینوں سے اے قاتل تیری کدورت کبھی دیکھی

بس دیکھتے ہی بنتی تھی وہ حسن و عشق کی معرکہ آرائی
اُس شوخ کے تیور بھی دیکھے اس دل کی جسارت بھی دیکھی

جو تیر کی جانب خود بھاگے ہے دل بھی ہرن کس صحرا کا
اے اچھی آنکھوں والو تم نے ایسی وحشت بھی دیکھی

کیا رنگِ طبیعت ہے اُن کا کیا دل میں یہ سوچا کرتے ہیں
روتے روتے دیوانوں میں ہنس دینے کی عادت بھی دیکھی

اک خون کی بوندمیں درد کی دنیا دیکھ لی میری آنکھوں نے
دنیا والے دل کہتے ہیں جس کو اس کی وسعت بھی دیکھی

بیگانہ سے لیلےٰ بھی ہو کر اے قیس صدائے انا لیلےٰ
آزادیٔ وحشت بھی دیکھی یہ قیدِ محبت بھی دیکھی

دم توڑتے وقت بھی ایک نظر کو مرنے والے ترس جائیں

ہم کشتوں سے لے چشم دوست حیا تیری مروت بھی دیکھی

کچھ کھویا ہوا کچھ دکھتا ہوا راحت ہے فراق نہ کلفت ہے

جو دیکھی جائے نہ آنکھوں سے اس دل کی وہ حالت بھی دیکھی

پیچھے تیرے رونے والے

پیچھے سے کل جہان گزر گیا ہے

۸۳

۱۹۳۷ء

کیا راہ ہے راہ محبت کی سانس آتے آتے ٹوٹ گئی
کیا بار ہے بار محبت کا دو گام میں ہمت چھوٹ گئی
وہ در وہ چوکھٹ کیا چھوٹی عشاق کی قسمت پھوٹ گئی
چاہا تھا کہ دل کو سمجھا لیں کچھ سوچ کے ہمت چھوٹ گئی
زنداں کی حقیقت ہی کیا تھی ہمت ہی یکایک ٹوٹ گئی
دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا دیوانوں کی قسمت پھوٹ گئی
تسکین کی باتیں کرتے ہو ہم جانتے ہیں جو ہونا ہے
جب اس سے بچھڑ کر جینا ہے تو یارو قسمت پھوٹ گئی

چاہا تھا جسے دیکھتے دل سے اس کی بھی نگاہ کیسی ہو گئی

اس شخص کی قسمت کیا کہئے یہ آس تھی جس کی ٹوٹ گئی

تم شرع میں دیکھ کے آئے ہو ہم دن کے آتے ہیں اُسے

کچھ تم کو خبر ہے کتنی دور الگ جاتی دنیا چھوٹ گئی

اے دوست ترے چلنے والے چلتے ہیں کیسی مصیبت سے

دوزخ کی بھڑک گئی آگ اُن پر سو مرتبہ پانی کو لوٹ گئی

دنیا میں ہیں اور بیٹھے ہیں گھر آگ محبت کی سلگے

کیا اپنی بھی مت ماری گئی کیا ساری سُدھ بُدھ چھوٹ گئی

انصاف کسی کا کیا چاہیں کیا عشق کی رسم نرالی تھی

جو اپنے ساتھ کسی نے کیا اسے مالک قسمت پھوٹ گئی

ہمراز نہیں دمساز نہیں، اللہ کوئی آواز نہیں
کیا عشق کی دنیا میں آتے ہی یہی دنیا چھوٹ گئی

ہے درد سا درد محبت کا ہے چوٹ سی چوٹ محبت کی
آنکھیں کبھی نہ پڑنے پائی تھیں اور منھ پہ ہوائی چھوٹ گئی

متوالے ہوش میں رہتے ہیں یہ بھید ان پہ نہ کھلا ہم پر
وہ سستی آنکھ وہ دل کی عقل جب ایک نظر میں لوٹ گئی

محشر کا دن جب ڈوب چلا انگڑائی لے لے کے اٹھے
ان آنکھوں کے اسے متوالو نیند اتنی جلدی ٹوٹ گئی

آگے شاید پڑتا ہے عدم کچھ ٹھیک نہیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراق نہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

۸۳

۱۹۳۶ء

بحثیں چھڑی ہوئی ہیں حیات و ممات کی

سو بات بن گئی ہے فراقؔ ایک بات کی

ساز نوائے درد حجابات دہر ہیں

کتنی دکھی ہوئی ہیں رگیں کائنات کی

رکھ لی جنوں نے کشمکش زندگی کی لاج

بیدردیاں نہ پوچھئے ان سے حیات کی

یوں فرطِ بیخودی سے محبت میں جان دے
تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہو اس واردات کی

ہے عشق اس تبسمِ جاں بخش کا شہید
رنگینیاں لیے ہے جو صبحِ حیات کی

چھیڑا ہے دردِ عشق نے تارِ رگِ عدم
صورت پکڑ چلی ہیں نوائیں حیات کی

شامِ ابد کو جلوۂ صبحِ بہار دے
روداد چھیڑ زندگیِ بے ثبات کی

اس بزمِ بیخودی میں وجود و عدم کہاں
چلتی نہیں ہے سانس حیات و ممات کی

سو درد اک تبسمِ پنہاں میں بند ہیں

تصویر ہوں فراقؔ نشاطِ حیات کی

دیا ہے عشق نے کیا کفر و ایماں کی حدیں چھپا کے کہیں

یہیں سے اور پیدا کر خدا اور حسن سے ستی

۸۴

۱۹۳۶ء

جہاں شناس بھی دنیا سے بے نیاز بھی ہے
کہ عشق رازِ جہاں بھی جہانِ راز بھی ہے
شریکِ کیفیتِ غم نگاہِ ناز بھی ہے
پیامِ یاس بھی دیتی ہے دلنواز بھی ہے
پیامِ کیفیتِ عدم نغمۂ مجاز بھی ہے
نوائے ساز صدائے شکستِ ساز بھی ہے

خبر بھی ہے کہ نہیں تیرے نازِ بے جا کو
نیازِ عشق سنا ہے کہ بے نیاز بھی ہے

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

خلوصِ ناز پہ معصومیِ ادا پہ نہ جا
کہ اس کی فطرتِ سادہ کرشمہ ساز بھی ہے

مزاجِ حسن کبھی خود شناس ہو نہ سکا
کچھ اختلاطِ نہاں بھی کچھ احتراز بھی ہے

یہ غزنوی کی پریشاں خیالیاں تسلیم
کچھ الجھنوں میں مگر گیسوئے ایاز بھی ہے

پڑے ہوئے ہیں جو تیرے ہوش و مستی میں
کچھ اُن سے کہنے کو وہ چشم نیم باز بھی ہے

کچھ ایسی بات نہ تھی جس سے اتنی بات بڑھی
زباں دراز بہت وہ سکوت ناز بھی ہے

ارے یہ پست نگاہی یہ احتیاط نظر
سیاہ کار ہے وہ آنکھ پاکباز بھی ہے

نہ پوچھ اہلِ تمنا کے اضطراب و سکون
کہ یہ اثر ہے محبت اثر کا راز بھی ہے

ہر اک کے زخمِ جگر میں اک اور عالم ہے
شکیل حسنِ حقیقت غم مجاز بھی ہے

لُٹے ہے عشرتِ نظارہ کیفِ وجدانی
یہ رنگ و بوئے جوانی نوائے راز بھی ہے
عجیب کشمکشِ ہوش و بیخودی ہے فراق
کہ مختصر بھی شبِ ہجر ہے دراز بھی ہے

رباعی

تو ہر لحظہ کچھ اور آتا ہے نظر
ہر جلوہ ہے پچھلے جلوے سے نازک تر
ہر خطِ بدن میں جذب ہے نغمہ جیسے
سوتی ہیں حقیقتیں لبِ شاعر پر